

جاسوسی دنیا نمبر 16

محققان

خونی پتھر

(مکمل ناول)

پیش لفظ

انور سیریز کا چوتھا ناول پیش کر رہا ہوں۔ یہ اس سیریز کا چوتھا اور آخری معمولی شمارہ ہے۔ پانچواں ناول اس سیریز کا خاص نمبر ہوگا جس میں انور اور رشیدہ کے ساتھ انکلیئر فریدی اور سر جٹ حمید بھی ہوں گے۔ میرا ارادہ تو یہی تھا کہ انور اور رشیدہ کے بارہ ناول پیش کروں گا لیکن اتفاق سے میرے چرے والوں میں دو گروہ ہو گئے ایک کا مطالبہ ہے کہ ”فریدی اور حمید“ سیریز پھر سے شروع کیا جائے اور دوسرا انور سیریز کو بھی پسند کر رہا ہے۔ بہر حال تعداد انہی لوگوں کی زیادہ ہے جو ”جاسوسی دنیا“ میں صرف فریدی اور حمید کے کارنامے دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ شمارے (خاص نمبر) سے پھر فریدی اور حمید کے کارنامے شروع کر دوں۔

پیش نظر ناول ”خونی پتھر“ میں ایک حیرت انگیز داستان ہے جو ایک سیاہ رنگ کے پیش قیمت پتھر کی چوری سے شروع ہوتی ہے اور ایک بھیا تک موڑ پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ جوں سال

پرائیویٹ جاسوس انور اس ناول کے شروع میں ہی ایک بھیاں ک
 جال میں پھنس جاتا ہے۔ کیا وہ درحقیقت جال تھا؟ پروفیسر
 تیموری کو کس نے قتل کیا تھا۔ اس کے بعد پھر ایک قتل اور کیا رابہ
 قاتل تھی؟ پروفیسر تیموری کے سیکریٹری کو بھی آپ قاتل سمجھیں
 گے، گھوڑیا بھی آپ کو قاتل ہی معلوم ہوگی اور سرسبز احمد تو
 سو فیصدی قاتل تھا۔ اس ناول کا ہر کردار آپ کو قاتل معلوم ہوتا
 ہے۔ لیکن حقیقتاً قاتل کون تھا؟ یہ معلوم کر کے آپ انگشت

بدندان رہ جائیں گے اور قتل کا مقصد؟ وہ بھی قاتل ہی کی طرح
 حیرت انگیز ثابت ہوگا، ”انور اور رشیدہ“ کی دلچسپ ٹوک جھونک
 سرکاری جاسوس اسپیکر آصف سے بھڑپیں۔ اس کے علاوہ اور بھی
 بکثیری دلچسپیاں۔

ابن مسعود

مذہب کے لئے اس کی قربانی کرنے والوں کو ان کی قربانی پر
 ان کی قربانی پر ان کی قربانی پر ان کی قربانی پر
 ان کی قربانی پر ان کی قربانی پر ان کی قربانی پر
 ان کی قربانی پر ان کی قربانی پر ان کی قربانی پر
 ان کی قربانی پر ان کی قربانی پر ان کی قربانی پر
 ان کی قربانی پر ان کی قربانی پر ان کی قربانی پر

پتھر کی واپسی

انور ایک گھٹیا سے ہوٹل میں بیٹھا سگریٹ کے پکے پکے شیشے کے رہا تھا۔ اسے حیرت
 ہو رہی تھی کہ آخر اسے دھوکہ کرنے والی نے اس نامعلوم ہوٹل کو کیوں منتخب کیا۔ اسے درمیان
 درجے کا ہوٹل بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ویسے اس کے مالک نے کوشش تو یہی کی تھی کہ اسے
 درمیانے یا اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں کی نقل بناوے اور شاید ایسا ہو بھی سکتا تھا مگر ملازمین یا منتظم کی
 پیدا کئی لاپرواہی اور بدسلوکی نے اس کی کوششوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ یہاں متعدد دیکھن ضرور تھے
 لیکن ان کے پردے یا تو پوشیدہ تھے یا گندے۔ قمری پلائی وڈ کے پارٹیشنوں پر جبکہ ہند سے
 لکھ کر جوڑے گئے تھے کہیں کہیں پان کھانے والوں کی کتھے اور چونے بھری اگلیوں کے نشانات
 بھی دکھائی دے رہے تھے۔ دیواروں پر برسوں پرانی تصویریں تھیں۔ جن پر نہ جانے کب سے
 گرد کی جھیں جستی چلی آ رہی تھیں۔ ان تصویروں کے درمیان کچھ طفرے بھی تھے جہاں کہیں ان
 سے جگہ جگہ گئی تھی وہاں کا کون کے لئے ضروری ہدایات لکھ کر چکا دی گئی تھیں۔ کچھ تحریریں قطعی
 غیر متعلق تھیں جنہیں انور بالترتیب پڑھ پڑھ کر الجھ رہا تھا۔

ان کی ترتیب کچھ اس قسم کی تھی۔

”براہ مہربانی فرش پر مت تھوکے۔“

”واپس ملی ہوئی روم کی اچھی طرح جانچ کر لیجئے۔“

”اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

”ملازمین سے جھگڑا کرنے کے بجائے اپنی شکایات کا اظہار منجبر سے کیجئے۔“

”شہنشاہ ایران زعمہ باد۔“

”جس خاندان پر ہے۔“

”نظر من اللہ فتح قریب“

”سورہ پے کوٹ کی ریز گاری نہیں ملے گی۔“

”طلب کی ہوئی اشیاء واپس نہیں لی جاتیں۔“

”اسلام زندہ باد“

”سیاسی گتکو سے پرہیز کیجئے۔“

”قیامت ضرور آئے گی۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔“

”بیشمل سینگ سرٹیکٹ خریدئے۔“

”پیٹ کے امراض کا واحد علاج چورن انارواند۔“

انور ان سب کو تیرہ چودہ بار دہرا چکا تھا۔ تقریباً چودہ منٹ قبل وہ یہاں پہنچا تھا اور اب انتظار کی معینہ مدت میں صرف دس منٹ اور باقی رہ گئے تھے۔ وہ یہاں کچھ عجیب و غریب حالات کے تحت آیا تھا۔ آج آفس میں اُسے کسی کم نام عورت کا خط ملا تھا جس میں اس نے اس سے استدعا کی تھی کہ وہ مذکورہ ہوٹل میں ایک بج کر پچیس منٹ تک اس کا انتظار کرے۔ اسے کسی بہت ہی اہم معاملے میں انور کی مدد درکار تھی۔ اس نے خط میں اس کیبن کا نمبر بھی لکھ دیا تھا جس میں ان دونوں کو ملنا تھا۔

انور کے لئے یہ پہلا اتفاق تھا کہ اُسے ایسے ہوٹل میں کسی نے مدعو کیا تھا۔ اُس سے عموماً وہی لوگ مدد لیا کرتے تھے جو کسی وجہ سے ٹکڑے پولیس سے رابطہ قائم کرنے میں ہچکچاتے تھے اور ایسے لوگ ابھی تک سو فیصدی دولت مند ہی ثابت ہوئے تھے ظاہر ہے کہ کسی پرائیویٹ جاسوس کے اخراجات کا بار عام آدمی نہیں اٹھا سکتا۔ لہذا انور کے لئے یہ چیز خاصی الجھن کا باعث بن گئی | تھی کہ اگر وہ دولت مند ہے اور کسی اونچی سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہے تو اُس نے ایسے ہوٹل کا انتخاب کیسے کیا۔

اس کی نظریں پھر دیوار سے لگے ہوئے کلاک کی طرف اٹھیں۔ پانچ منٹ اور باقی رہ گئے تھے۔ بس منٹ اُس نے کسی نہ کسی طرح گزار دیئے تھے۔ لیکن یہ پانچ منٹ اس کے خیال کے

مطابق وبال جان بننے والے تھے۔ اس دوران میں ہوٹل کے کئی کمرے لڑکے اس کے آرڈر کے لئے کیمین کا چکر لگا چکے تھے حالانکہ انہیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کسی کا انتظار کر رہا ہے۔ لیکن پھر بھی ان میں سے ایک نے ایک تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کیمین کے سامنے آکر اڑا ہوا جانا تھا۔ شاید اس رویے کی محرک معقول قسم کی شپ کی توقع تھی۔ آخر وہ پانچ منٹ بھی گزر گئے۔ انور مجنملا کر اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ایک نوجوان عورت کیمین کے سامنے آ کر رہی۔ اس نے ایک معمولی سی سفید ساری باندھ رکھی تھی۔ ہیر میں سیاہ پیٹنٹ کے پرانے میڈل تھے جن کا وارنٹس کہن کی وجہ سے جگہ جگہ سے چٹا ہوا تھا۔ عمر مشکل انیس میں کی رہی ہوگی۔ جسم صحت مند اور شخصیت جاذب توجہ تھی۔ حسین بھی تھی لیکن اتنی نہیں کہ اس پر شعر کہے جا سکیں۔ آنکھوں میں چمکیا ہٹ یا شرمیلے پن کے بجائے ایک عجیب قسم کی بے تعلقی تھی۔ وہ ایک لمحہ تک انور کو تنقیدی نظروں سے دیکھتی رہی پھر مسکرا کر آگے بڑھی۔

”مسٹر انور...!“ اس نے کیمین میں داخل ہو کر آہستہ سے کہا۔

”آپ کا خیال صحیح ہے۔“ انور اٹھنے کی بجائے کرسی کی پشت سے ٹپک لگا ہوا بولا۔

”کیا مجھے دیر ہوگی؟“ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

”آپ کا یہ خیال بھی صحیح ہے۔“ انور سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ دو منٹ دیر سے پہنچیں۔“

”مجھے افسوس ہے کیا آپ دوپہر کا کھانا کھا چکے ہیں۔ میں آپ کو یہ کھانا بھول گئی تھی کہ

ہم کھانا بھی ساتھ ہی کھائیں گے۔“

”کیا آپ اس ہوٹل میں۔“ انور چونک کر بولا۔

”جی ہاں... کیوں؟“

”مجھے افسوس ہے کہ مجھے چمپکیوں اور چوہوں کا قورمہ قطعی مرغوب نہیں۔“ وہ بے اختیار

ہنس پڑی۔

”بھئی آپ ٹھہرے بڑے آدمی۔“ وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ ”ہم غریب لوگ تو یہی سب کچھ

کھانے کے عادی ہیں۔“

انور اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر اس کی آنکھیں اس کے نرم و نازک ہاتھوں پر

جم گئیں جو تک مرمر کے تراشوں کی طرح سبک اور بے دارغ تھے۔

”لیکن آپ کے ہاتھ تو یہ نہیں کہتے۔“ انور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

اس نے چونک کر اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“ وہ اسے گھور کر بولی۔

”بجی کر آپ کے ہاتھ کام کرنے کے عادی نہیں معلوم ہوتے۔“

”خیر ہوگا۔۔۔۔۔!“ وہ جلدی سے بولی۔ ”ہمیں کام کی بات کرنی چاہئے۔“

”میں نے آپ کو اس سے روکا تو نہیں۔“ انور نے اگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

”لیکن کام کی نوعیت جان لینے کے بعد آپ کو انتہائی راز داری سے کام لینا پڑے گا۔

کیونکہ یہ ایک شریف آدمی کی عزت کا معاملہ ہے۔“

”آپ کا یہ جملہ قطعی غیر ضروری ہے۔ لوگ میرے پاس راز داری ہی کے لئے آتے

ہیں۔“ انور نے خشک لہجے میں کہا۔

لڑکی نے بلاؤز کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی اور اسے کھول کر انور

کے سامنے رکھ دیا۔ انور چونک کر لڑکی کو گھورنے لگا۔ چند لمبے خاموشی رہی۔ کبھی وہ ڈبیا کی طرف

دیکھتا تھا اور کبھی لڑکی کی طرف۔ پھر اس نے ڈبیا سے کوئی چیز نکالی اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ یہ

ایک سیاہ رنگ کا پتھر تھا۔ جس کی گہرائیوں سے ہری، نیلی اور پیلی کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں۔

”سیاہ کھراج۔۔۔۔۔!“ انور آہستہ سے بڑبڑایا۔

”اے ستارے کا کھرا بھی کہتے ہیں۔“ لڑکی نے کہا۔

”ستارے کا کھرا۔۔۔۔۔!“

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ اسی نام سے مشہور ہے۔“

انور نے پتھر ڈبیا میں رکھ کر ڈھکنا بند کر دیا اور استہمامیہ انداز میں لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

”اے اس کے مالک تک واپس پہنچانا ہے۔“ لڑکی آہستہ سے بولی۔

”یہ کام تو آپ خود بھی کر سکتی ہیں۔“

”نہیں! یہ اس طرح اسے واپس کیا جائے کہ خود اسے بھی اس کا علم نہ ہو۔“ لڑکی ہچکچاہٹ

کے ساتھ کہنے لگی۔ ”یعنی اسے وہیں رکھ دینا ہے جہاں یہ رکھا ہوا تھا۔“

”اوہ.....“ انور کچھ سوچنے لگا۔

”کیا آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔“

”ابھی طرح سمجھ گیا۔“ انور اسے تیز نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔ ”مثلاً یہ چلایا گیا تھا۔“

”نیت تو یہی تھی مگر اب چرانے والے نے اپنا خیال بدل دیا ہے۔“ لڑکی نے کہا۔

”تو کیا آپ ہی نے.....؟“

”جی نہیں!“ وہ انور کی بات کاٹ کر بولی۔ ”میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں ایک

دوسرے آدمی کے لئے آپ سے معاملات طے کر رہی ہوں۔“

”لیکن میں نے اس قسم کا کام آج تک نہیں کیا۔“

”معاذہ مشعل طے گا۔“ لڑکی اس کی بات پر دھیان نہ دیتی ہوئی بولی۔

”تو یہ واپس کہاں جائے گا۔“ انور نے پوچھا۔

”پہلے آپ اس کا وعدہ کر لیجئے۔“

”آپ بھی بچوں کی سی باتیں کرتی ہیں۔“ انور چڑ کر بولا۔ ”میں کیا کوئی بھی اس کے

حقوق سب کچھ جانے بغیر کسی قسم کا وعدہ نہیں کر سکتا۔“

”خیر..... مگر ایک شرط ہے۔ کام نہ کرنے کی صورت میں بھی آپ اخلاقات سے راز رکھنے

پر مجبور ہوں گے۔“

”مستحور.....؟“

”یہ پتھر اہر اہر نیات پر دیو فسر تیموری کی ملکیت ہے۔ کم از کم اُن کا نام تو سنا ہی ہوگا۔“

”دیو فسر تیموری۔“ انور اپنے حافظے پر زور دینے لگا۔ ”وہی تو نہیں جس نے پچھلے سال

قیسٹی پتھروں کی بین الاقوامی نمائش میں حصہ لیا تھا۔“

”وہی..... کیا آپ اُس سے واقف ہیں۔“

”نہیں.....؟“ انور سرگرمی سے سلگتا ہوا بولا۔

”یہ پتھر ایک شوکیں میں رکھا جائے گا جو اس کے پتھروں کے ذخیرے والے کمرے میں

رکھا ہے۔“

”ہوں۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”تو کیا آپ مجھے چھٹی کے خرام میں گرفتار کرنا چاہتی ہیں۔“
”آپ خواہ مخواہ خوفزدہ ہو رہے ہیں۔“ لڑکی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں آپ کو ان حالات میں کبھی نہ سمجھوں گی کہ آپ پکڑے جاسکیں۔“

”یعنی۔۔۔“

”آج رات کو پورے گھر پر نہیں ہوگا۔ اس کی دہائی کل شام سے پہلے نامکمل ہے۔“
”غوب۔۔۔“ انور میز پر جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔
”وہ بہت فلی آدی ہے۔ اس لئے اس کے گھر میں توکر نہیں ہیں۔ صرف ایک مسٹر سیکرٹری ہے جو چھروں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔“

”اچھا اگر اسی مسٹر سیکرٹری سے شرف ملاقات حاصل ہو گیا تو۔“ انور مسکرا کر بولا۔
”سیکرٹری بھی آج رات کو موجود نہ رہے گا۔“

”آپ سب کچھ جانتی ہیں۔“ انور نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”جب اتنی آسانیاں موجود ہیں تو آپ خود ہی یہ سب کام کیوں نہیں کر ڈالتیں۔“
”بعض حالات کی بناء پر میں خود ایسا نہیں کر سکتی۔“
”عجیب بات ہے۔“ انور نے کہا اور کچھ سوچے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ”میں معمولی چھروں کی طرح کسی مکان کا نالا توڑنا پسند نہیں کرتا۔“

”نالہ توڑنے کو کون کہتا ہے۔“ وہ اٹھلا کر بولی۔ ”آپ تالے کھول کر مکان کے اندر داخل ہوں گے۔“

”یعنی۔۔۔“

”میرے پاس کچیاں موجود ہیں۔“

”اوہ۔۔۔!“ انور پھر چوک پڑا۔

”آپ کو کوئی دشواری نہ ہوگی۔ مکان دریا کے کنارے ایک غیر آباد مقام پر ہے۔ سونا گھاٹ پر۔ وہاں صرف دہائی ایک کوشی ہے جس کے گرد آسمان کا بارغ ہے۔ صدر دروازہ مشرق کی

جانب ہے جس کا کئی بھی یہ رہی۔ اس کے بعد ایک بڑا کمرہ ہے غالباً وہ بھی قتل ہوگا۔ لہذا اس کی کئی بھی آپ لے سکتے ہیں۔ اسی کمرے میں وہاں طرف ایک دروازہ ملے گا یہ بھی قتل ہوگا اور یہی اس کمرے کا دروازہ ہے جس میں پتھروں کا ذخیرہ ہے۔“

انور خاموشی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے سامنے میز پر تین بچیاں بڑی ہوئی تھیں۔

”بہت خطرناک کام ہے۔“ انور آہستہ سے بولا۔ ”لیکن پروفیسر تیسوری جانے گا کہاں۔“

”تار جام کے پہاڑی علاقے میں۔ وہ آج صبح چلا بھی گیا۔“

”وہاں کیا کرنے گیا ہے۔“

”وہاں اس کا ایک دوست رہتا ہے اُسے بھی اسی کی طرح پتھروں سے دلچسپی ہے اور وہ

اس کا کاروبار بھی کرتا ہے۔“

”اُس کا نام.....؟“

”کولس..... وہ صیائی ہے اور وہاں اس کا شوروم بھی ہے۔“

”سیکرٹری کہاں جانے گا.....؟“ انور نے پوچھا۔

”اس کے متعلق مجھے علم نہیں لیکن اس کی عدم موجودگی کا سو فیصدی یقین ہے۔“

”اس پتھر کے متعلق اور کچھ نہیں بتا سکتیں۔“

”مجھے فحس ہے۔“

”مجھے اس سے زیادہ فحس ہے۔“ انور اٹھتا ہوا بولا۔

”مسٹر انور.....“ لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لہجے میں التجا تھی۔ ”یہ ایک شریف آدمی

کی عزت کا معاملہ ہے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ آپ تیار ہو جائیں گے۔“

”میں اس قسم کا کام نہیں کرتا۔“

”آپ کی ہر شرط مجھے منظور ہوگی۔“

انور کو دھتا اپنے بیک بیلٹس کا خیال آ گیا۔ جو روز بروز کم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ چند لمبے لڑکی

کی طرف دیکھتا رہا پھر بیٹھ گیا۔

”خبر میں کوشش کروں گا۔“

”اس کیلئے آپ کتنا معاوضہ طلب کرتے ہیں۔“ لڑکی کے لہجے میں خوشی کی چمکپاہٹ تھی۔
 ”معاوضے کی باتیں بعد کو ہوں گی۔ ابھی صرف میں نے کوشش کرنے کا وعدہ کیا ہے اگر کامیاب ہو گیا تو ضرور نہ آپ کی چیزیں کل دوپہر تک واپس کر دوں گا۔“
 ”چلے متھورا! میں آپ کو کل اسی وقت یہاں ملوں گی۔“
 ”آپ کا نام۔۔۔۔۔۔“

”مجھے اس کیلئے مجبور نہ کیجئے۔“ لڑکی نے کہا اور ہوٹل کے لڑکے کو بلا کر کھانے کا آرڈر دیا۔
 انور نے تجلیاں اور ڈیپا اٹھا کر جیب میں ڈال لیں۔
 ”میرا فون نمبر ۵۴۰ ہے۔“ انور نے اٹھتے ہوئے کہا۔
 ”تو کیا آپ واقعی کھانا نہ کھائیں گے۔“ لڑکی نے پوچھا۔
 ”نہیں اور آپ کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ آپ بھی محض دکھاوے کیلئے اپنا معدہ خراب نہ کیجئے۔“
 ”دکھاوے کے لئے کیوں؟“

”آپ کا تعلق حیکماں طبقے سے نہیں جس میں آپ خود کو کھانا پاتی ہیں۔“
 ”تو کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں۔“ وہ گہرا کر بولی۔
 ”قطعی نہیں ایہ محض میرا اندازہ ہے۔“ انور نے سنجیدگی سے کہا اور ہوٹل سے نکل کر فٹ
 پاتھ پر آ گیا۔ چہلے کھڑا سوچتا رہا پھر داہنی طرف مڑ گیا۔ کچھ ہی دور آگے چل کر وہ ایک
 چھوٹے سے ریسٹوران میں گھس گیا۔

”سید۔۔۔۔۔۔“ اس نے ایک لڑکے کو آہستہ سے پکارا۔ شہر میں متعدد جگہوں پر اس کے
 گھر موجود تھے۔ یہ بھی انہی میں سے ایک تھا۔ اس قسم کے لوگ چھوٹی چھوٹی راتوں کے عوض
 اس کی مدد کرتے تھے اور پھر انہیں یہ بھول جاتا پڑتا تھا کہ انہوں نے کسی اس کا کوئی کام کیا تھا۔

شو روم

”سید! تمہارے لئے فی الحال ایک مقول آمدنی کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔“ انور نے کہا۔

”فرمائیے صاحب۔“

”اسی لائن میں مدینہ ہوئی ہے نا..... وہاں کہیں نمبر ۵ میں ایک لڑکی کھانا کھا رہی ہے
جہیں اس کے حلقہ معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔“

”اچھا صاحب۔۔۔۔۔۔“

”لیکن جلدی کرو وہ سفید ساری اور پیاز کی بلاؤں پہنے ہوئے ہے۔“

سعید باہر چلا گیا اور انور نے دھڑکنے لڑکے کو بلا کر کچ کا آرڈر دیا۔

کھانا کھا چکے کے بعد وہ کافی کی پیالی اور سگریٹ کے ہلکے کتوں سے لطف اندوز ہوتا
رہا۔ اُسے یقین تھا کہ سعید کافی دیر میں آئے گا کیونکہ وہ اس قرب و جوار کی رہنے والی نہیں معلوم
ہوتی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس گھٹیا سے ہوئی میں بیٹھ کر کھانا نہ کھاتی اور اُسے پورا پورا یقین تھا
کہ وہ حوصلہ جلتے سے تعلق نہیں رکھتی۔

اس کی توقعات کے خلاف سعید آدھ گھنٹے کے اندر ہی اندر واپس آ گیا۔

”صاحب..... وہ اگلے چوراہے تک پیدل ہی گئی۔ اس کے بعد فریج لاٹھری کے سامنے
والی گلی میں سرگئی۔ کچھ دور چل کر ایک چھوٹی سی کار میں بیٹھی اور نہ جانے کدھر کل گئی۔ وہاں مجھے
کوئی گئی جی بھی نیل کی کہ اس کا پیچھا کرتا۔“

انور نے برا سا منہ بنایا۔

”کیا کار میں کوئی اور بھی تھا۔“

”جی نہیں..... وہ خود ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔“

”کار کا نمبر کیا ہے۔“

”جی ہاں وہ تو میں نے لکھ لیا تھا۔“ وہ اپنی جیبیں ٹٹولا ہوا بولا۔

”خیر تم نے یہ کام عمل مندی کیا کیا۔“ انور نے اس کے ہاتھ سے پرچہ لیتے ہوئے کہا۔

پرچے پر ایک نظر ڈال کر اس نے اسے جیب میں رکھ لیا۔

”یہ لو.....“ اس نے پانچ کا ایک نوٹ لڑکے کی طرف بوجھاتے ہوئے کہا۔ ”اور اب

اسے بھول جاؤ۔“

رہے تو راتوں سے اٹھ کر وہ آفس آیا۔ رشیدہ دیر سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے ابھی تک اسی کے انتظار میں کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ انور کو دیکھتے ہی وہ برس پڑی۔

”اگر تم بچ کے وقت واپس نہیں آ سکتے تھے تو تمہیں کہہ کر جانا چاہئے تھا۔“

”تم خواہ مخواہ میرا انتظار کیا کرتی ہو۔“ انور نے خشک لہجے میں کہا۔

”تو کیا آفس میں لانے کا ارادہ ہے۔“

”آفس کیا میں ہر جگہ لانے پر آمادہ رہتا ہوں۔“

”میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھلیا۔“

”بہت اچھا کیا۔۔۔۔۔ اکثر دوپہر کا کھانا گول کر جانے سے معدہ ٹھیک رہتا ہے۔“

”خیر اتم معکھ اڑو۔۔۔۔۔ لیکن کسی دن تمہارے معدے کا بھی معقول علاج کر دیا جائے گا۔“

”تم مجھے دھمکانے کی کوشش نہ کرو۔۔۔۔۔ میں ایک ہفتہ تک بغیر کھانا کھائے زندہ رہ سکتا ہوں۔“

”تم ہونا سے جنگلی جانور۔۔۔۔۔ ریگستانی اونٹ۔“ رشیدہ نے ہنسنے لگا کر کہا۔

”رٹو ڈارنگ۔۔۔۔۔!“ انور رومانٹک انداز میں بولا۔

”میں کسی قسم کی چالپوسی کے لئے تیار نہیں۔“

”میں یہ کہنے جا رہا تھا کہ میں ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی سے مل کر آ رہا ہوں۔“

”تو میں کیا کروں۔“

”ممبر کرو۔“ انور اسے دردناک لہجے میں بولا کہ رشیدہ کے سکوڑے ہوئے ہونٹوں پر ایک

بے اختیار مسکراہٹ کی ارزشیں نظر آنے لگیں۔

”اچھا تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

”میں یہی کہنے کے لئے آیا ہوں کہ میرا انتظار نہ کرنا۔ میں تار جام جا رہا ہوں۔“

”جاؤ نقصان ہو۔“ رشیدہ جلدی سے بولی۔ لیکن پھر انور کو گھبرانے لگی۔ ”کیوں تار جام کیوں

جار ہے ہو۔۔۔۔۔؟“

”ایک دلچسپ کہس ہاتھ آ گیا ہے۔“

”کیس ہی کیس ہاتھ آیا ہے یا کچھ لٹے کی بھی امید ہے۔“

”تمہیں یہ کام تو میں فی سبیل اللہ کر رہا ہوں۔“ انور کے چہرے پر مصویت پھیل گئی۔

”ہوگا..... مجھے کیا۔“ رشیدہ اٹھتی ہوئی بولی۔ ”میں کھانا کھانے جا رہی ہوں۔“

”میں تمہیں روک تو نہیں رہا ہوں۔“ انور نے کہا اور سگریٹ کے لئے جیب ٹٹولنے لگا۔

پھر پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر اس کے سرے کو اسی طرح دیکھنے لگا جیسے اس میں سے کسی ہاتھی کے برآمد ہونے کی توقع رکھتا ہو۔ رشیدہ کرسی کھدکا کر جانے لگی۔

”غصہ ہو.....؟“

رشیدہ پلٹ کر اُسے گھورنے لگی۔ انور نے جیب سے کانڈکا ایک ٹکڑا نکال کر اُس کے ہاتھ

پر رکھ دیا۔

”تمہیں اس خبر کی کار کا پتہ لگانا ہے۔“ اُس نے آہستہ سے کہا۔

”کیوں؟ میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

”میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس خفیہ صورت لڑکی سے میں نے کچھ کاروباری باتیں کی تھیں۔“

”کی ہوں گی۔ مجھے اس سے کیا غرض۔“

”خیر تو اسے ادھر لادو۔“ انور کانڈکا ٹکڑا پھر جیب میں رکھتا ہوا بولا۔ ”تم جا سکتی ہو۔“

”نہیں جاتی۔“ رشیدہ تیز لہجے میں بولی۔ ”تم آخر اسے حکمتانہ لہجے میں کیوں گفتگو کرنے

لگے ہو۔“

”اس لئے کہ میں آج کل ڈیوگرے کا بال اسرت استعمال کر رہا ہوں۔ جاؤ نظروں سے

دور ہو جاؤ۔“

”دیکھو..... میں تمہیں یہیں آفس میں چائنا ماروں گی۔“

”اور میں یہیں آفس میں تمہارا مقبرہ بنا کر قوالی شروع کر دوں گا۔“

”جنگلی.....“ رشیدہ ہیر پھٹی ہوئی چلی گئی۔

انور نے سگریٹ سٹاک کر دو تین لمبے لمبے کش لئے اور کھڑا ہو کر کچھ سوچتا رہا پھر وہ بھی دروازے

کی طرف بڑھا۔ نیچے فٹ پاتھ پر موٹر سائیکل کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے پٹرول کی ٹینکی کھول کر

پٹرول دیکھا اور پھر دوسرے لمبے میں موٹر سائیکل سڑک پر فرائے پھرنے لگی۔ بائم روڈ کے

چوراہے کے پٹرول پمپ سے اس نے کچھ اور پٹرول لیا اور تار جام والی سڑک پر گاڑی موڑ دی۔
 تین بج چکے تھے۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ پانچ بجے تک تار جام ضرور پہنچ جائے گا۔ راستہ
 اس سے کم وقتے میں بھی طے ہو سکتا تھا لیکن آگے چل کر پہاڑی علاقہ شروع ہو جانے کی وجہ
 سے سڑک نامہوار ہو گئی تھی اور کہیں کہیں تو اتنے خطرناک موڑ تھے کہ ذرا سی لغزش سوار اور سواری
 دونوں کو پاتال کی سیر کرا سکتی تھی۔

تار جام شہر سے پورے ساٹھ میل کے دوری پر واقع تھا۔ اب سے دس سال قبل یہ ایک
 بالکل ہی اجازت علاقہ تھا۔ کہیں کہیں غریبوں کے کنارے چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد تھے۔ وہ بھی
 اس بارہ چھوٹوں سے زیادہ کے نہ ہوں گے۔ اچانک دوسری جنگ عظیم کے دوران میں اس کے
 دن پھر مہمے۔ ویسے تو جنگ سے قبل ہی سے ماہرین ارضیات کا خیال تھا کہ اس علاقے میں لوہے
 اور کوئلے کی کانیں موجود ہیں لیکن کوئی کان کئی کے لئے تیار نہ ہوا تھا جب شروع ہوتے ہی اس
 چیز کی طرف دھیان دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں لوہے کے کئی کارخانے قائم ہو گئے۔ پھر رنڈ
 رنڈ ایک چھوٹا سا شہر آباد ہو گیا۔ انور وہ ایک بار اس طرف آچکا تھا اس لئے وہ زیادہ احتیاط
 کے ساتھ موٹر سائیکل نہیں چلا رہا تھا۔ یہاں کے سارے خطرناک موڑ اس کے دیکھے ہوئے
 تھے۔ تار جام سے تین میل ادھر ہی اسے سڑک کے کنارے ایک بڑا سا بوڑھا دکھائی دیا۔ یہ کولس
 کے شوروم کا بوڑھا تھا۔ انور بے اختیار چوٹک پڑا۔ شہر کے باہر شوروم قائم کرنے کا مقصد اس
 کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔
 یہاں کی زمین ہوا رتھی۔ اس لئے انور نے موٹر سائیکل کا رخ عمارت کی طرف پھیر دیا۔ جیسے ہی
 وہ عمارت کے قریب پہنچا ایک جگہ سا بوڑھا آدمی اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک
 میلی سی فوجی وردی پہن رکھی تھی جس میں مہدا سا پائپ دبا ہوا تھا۔ تھکی مونچھوں کے سفید بال جن
 کے نچلے حصے سرخی مائل تھے بل کھا کر نیچلے ہونٹ کو چھو رہے تھے۔ سفید بھروسے کے نیچے سرخ
 سرخ آنکھیں حد درجہ خوفناک معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور گالوں کی بندھنوں
 کے اجمار پیشانی کی سطح سے بھی آگے نکلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

”کیا بات ہے“ اس نے حکمانہ لہجے میں پوچھا۔

”مجھے مسٹر نکولس سے ملتا ہے۔“ انور نے کہا اور مشین بند کر دی۔

”بوڑھا عمارت کے دروازے کی طرف اشارہ کر کے ہٹ گیا۔“

”تم چوکیدار ہو۔“ انور نے آہستہ سے پوچھا۔

”نہیں.....!“ وہ کڑے لہجے میں بولا۔ ”حوالدار میجر۔“

انور کو بے اختیار چارلی چپلن یاد آ گیا۔ لیکن اس نے اپنے قہقہے کو ہونٹوں تک نہ آنے دیا۔ موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے وہ عمارت میں داخل ہو گیا۔ ایک وسیع کمرے میں چاروں طرف مختلف قسم کے معمولی اور غیر معمولی پتھروں کے نمونے رکھے ہوئے تھے۔ قیمتی اور چھوٹے گلوے عموماً شیشے کے شوکیوں میں نظر آ رہے تھے۔ سامنے غالباً دوسرا کمرہ تھا جس کے دروازے میں سیاہ رنگ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اندر سے کچھ آوازیں آرہی تھیں۔ دلچسپ ایک دہلا پٹا آدی پردہ ہٹا کر شوروم میں داخل ہوا۔ وہ انور کی طرف استغہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”میں ادھر سے گذر رہا تھا۔“ انور ہچکچاتا ہوا بولا۔ ”آپ کا سائن بورڈ دیکھ کر بے چین

ہو گیا..... یعنی..... میں..... میں۔“

”آپ کو پتھروں سے دلچسپی ہے۔“ آنے والے نے مسکرا کر جملہ پورا کر دیا۔

”جی ہاں..... جی ہاں۔“ انور جلدی سے مضطربانہ انداز میں بولا۔

”شوق ہے۔“ اس نے چاروں طرف ہاتھ گھماتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔

انور پتھروں کو بخور دیکھنے لگا۔ آنے والا اُسے توجہ اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد انور پورے کمرے کا پتھر لگا کر ایک بڑے شوکیس پر دوبارہ جھک گیا۔ ایک سیاہی مال سرخ پتھر اس کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

”کاش..... کاش..... میں کیا تاؤں۔“ انور اس کی طرف مڑ کر متاسفانہ انداز میں ہاتھ ہلاتا

ہوا بولا۔

وہ استغہامیہ انداز میں انور کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”میں اس پتھر کے بارے میں کہہ رہا تھا۔“

آنے والا شوکیس پر جھک گیا۔ پھر انور کی طرف دیکھنے لگا۔

”میرا مطلب..... یہ کہ..... کاش اس کی سیاحی اور گہری ہوئی۔“ اور جیسے ساختہ بولا۔
 ”سیاح بکھراج۔“

وہ اُسے چونک کر دیکھنے لگا اور دوسرے کمرے میں بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ انور نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک بھاری بھر کم آدمی اسے گھور رہا تھا۔ اس کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان میں رہی ہوگی۔ قوی مضبوط تھے اور سر غیر معمولی طور پر بڑا تھا اور آنکھیں اسی حد تک چھوٹی تھیں۔ بھروسے میں ایک آدھ سفید بال بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ سفید قمیض اور سفید جملوں میں لمبوس قاتانہ جانے کیوں اسے دیکھتے ہی انور کے ذہن میں اچھی کا تصور بیدار ہو گیا۔
 ”آپ سیاح بکھراج کی بات کر رہے تھے۔“ وہ انور کو مٹھک نظر دے دیکھتا ہوا آہستہ سے بولا۔

”جی ہاں..... جی ہاں..... میرا خیال ہے کہ وہ بہت ہم کم باب ہے۔“

”آپ کو پتروں سے دلچسپی ہے۔“

”جی ہاں..... تجھوڑی بہت..... ابھی نیا نیا شوق ہے۔“

”کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”مغرور..... مغرور..... مجھے چلا دے کہتے ہیں۔“

”خوب۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”قابلاً آپ شہر ہی میں رہتے ہیں۔ کبھی میرے یہاں تشریف لائے۔ سونا گھاٹ پر تھوڑے منزل میں رہتا ہوں۔ مجھے بھی پتروں سے دلچسپی ہے۔ مجھے لوگ پروفیسر تھوری کہتے ہیں۔“

”اودہ بڑی خوش ہوئی آپ سے مل کر۔“ انور لہک کر بولا۔ ”میں نے پتروں کی بین الاقوامی نمائش کے سلسلے میں آپ کے حلقہ پڑھا تھا۔ میری خوش قسمتی ہے کہ آج اسے بڑے آدمی سے اتفاق ملاقات ہو گئی۔“

پروفیسر تھوری فخریہ انداز میں مسکرانے لگا۔ لیکن انور کو اس کی غمی غمی آنکھوں میں بھیجی ہوئی بے چینی صاف نظر آ رہی تھی۔ انور تجھوڑی دیر خاموش رہ کر دوسرے آدمی سے مخاطب ہوا۔
 ”میں کسی دن مغرور آؤں گا..... میں کوئی ذی حیثیت آدمی نہیں ہوں لیکن شوق کو کیا کیا

جائے۔ ابھی میرے پاس بہت زیادہ قیمتی پتھر نہیں ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ ضرور تشریف لائیے۔“ وہ تاجرانہ خوش اخلاقی کے ساتھ بولا۔ ”یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہر شوق شروع میں کم مانگی کا شکار رہتا ہے۔“

”بریکسل تو کہہ۔“ پروفیسر تیموری بولا۔ ”کیا میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے۔“

”ذریعہ معاش.....!“ اور شرمانا ہوا بولا۔ ”نہ پوچھیے تو بہتر ہے۔“

”پھر بھی.....!“

”ردی کاغذ کا بیوپاری ہوں۔“

”بہت اچھا ہے..... بہت اچھا۔“ دوسرا آدمی اپنی دانست میں اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہوا بولا۔ ”آپ اس تجارت میں کروڑ پتی بھی ہو سکتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ میں نے اس سے پہلے بھی آپ کو کہیں دیکھا ہے۔“ پروفیسر نے کہا۔

”ہو سکتا ہے۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”ظاہر ہے کہ ہم لوگ ایک ہی شہر کے باشندے ہیں اور مجھے پچھلیوں کے شکار کا بھی شوق ہے۔ ممکن ہے آپ نے مجھے سونا گھاٹ پر دیکھا ہو۔“

پروفیسر تیموری نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن وہ کچھ مٹھلک نظر آ رہا تھا۔ انور نے زیادہ دیر تک ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔

”اچھا..... اس تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔“ انور نے کہا اور واپس جانے کیلئے مڑا۔

”کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔“ دوسرا آدمی دیر تک دہراتا رہا۔

انور موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے جا رہا تھا کہ پیچھے سے ایک کڑکراتی سی آواز سنائی دی۔

”اٹھن شن.....!“

انور چونک پڑا۔ مٹی دردی والا بوڑھا منہ میں پائپ دہائے ہوئے اسکی طرف بڑھ رہا تھا۔

”تم نے مجھے چوکیدار کہا تھا؟“ اس نے چند دھڑکن مرحوم کی طرح جھانگیرانہ اعزاز میں پوچھا۔

”مجھے دھوکہ ہوا تھا۔“ انور آہستہ سے بولا۔

”میں حوالدار میجر ہوں۔ حوالدار میجر شمشیر سنگ۔“ بوڑھے نے اپنی چھاتی ٹھونکتے ہوئے کہا۔

”اچھا آداب عرض، منہجر صاحب۔“ اور نے مسکرا کر کہا اور موٹر سائیکل اشارت کر دی۔
 ”کوئی ک مارچ.....!“ بڑھاپا ملنے کے بل پیچھا لیکن مشین کے شور میں انکی آواز ابھرنے لگی۔
 اور شہر کی طرف واپس جا رہا تھا۔ لڑکی کے قول کی تصدیق ہو گئی تھی۔ لیکن کولس کا شور دم
 اُسے الجھن میں ڈالے ہوئے تھا۔ آخر شہر سے دور ویرانے میں شور دم قائم کرنے کی کیا ضرورت
 تھی۔ شور دم عموماً ایسے بازاروں میں ہوتے ہیں جہاں زیادہ سے زیادہ گاہک متوجہ ہو سکیں۔ اگر
 شہر میں اسکا کوئی شور دم موجود ہوتا تو تاز جام والے شور دم کو اسٹور بھی سمجھا جاسکتا تھا۔ خبر
 یہ سب چیزیں تو الگ رہیں۔ انہیں کولس کی جگہ بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ یا کوئی کاروباری
 مصلحت۔ لیکن وہ لڑکی کون تھی۔ اس کا پروفیسر تیوری سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ وہ کالا پتھر اس
 کے ہاتھ کیسے لگا اور پھر جب وہ پروفیسر اور اس کے سیکرٹری کے پروگرام سے واقف تھی اس کے
 مکان کی تنجیاں اس کے پاس تھیں تو پھر خود اسی نے اس پتھر کو واپس کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی
 ۔ جب یہ معاملہ اتنا ہی عجیب تھا کہ اس نے اپنا نام ظاہر کر سکی تھی تو پھر ایک اور راز دار
 بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ جیسے جیسے انور ان چیزوں پر غور کر رہا تھا انکی بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔
 آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی تاریکی نے اُسے اپنے دامن میں چھپالیا۔

غیر متوقع حادثہ

گھر پہنچ کر اس نے سارے حالات رشیدہ کو بتا دیے اور وہ پتھر بھی دکھا دیا۔
 ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم روز بروز اسے بیوقوف کیوں ہوتے جا رہے ہو۔“ رشیدہ جھلا
 کر بولی۔
 ”کیوں.....؟“

”مجھے تم سے اس کی توقع نہیں تھی کہ تم کوئی ایسا کیس بھی لے لو گے جس کے لئے تمہیں
 چوروں کی طرح گھروں میں گھسنا پڑے۔“
 ”ذرا سوچو تو یہ چیز کتنی شاعرانہ ہوگی کہ میں ایک چرائی ہوئی چیز چوروں کی طرح واپس

کرنے جاؤں گا۔“

”میرا خیال ہے کہ تم کسی زبردست جال میں چپنے والے ہو۔“

”ممکن ہے۔“

”میں تمہیں ہرگز اس کی رائے نہ دوں گی۔“

”تمہاری رائے کی پرواہ کون کرتا ہے۔“

”تم۔ تم۔ ا۔“ رشیدہ چیخ کر بولی۔ ”تمہیں میری رائے کی پرواہ کرنی پڑے گی۔“

”چ۔ چ۔ ا۔“ انور فسوس کرتا ہوا بولا۔ ”تم بہت چپنے لگی ہو۔ یہ سچ تمہاری صحت پر

اثر ڈالے گی۔“

”بمقابلہ چاہے مچھلے اڑاؤ لیکن میں تمہیں ہرگز نہ جانے دوں گی۔“

”اسی لئے میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“ انور مصممیت سے بولا۔

”دیکھو انور۔۔۔ کہیں مجھے سخت نہ ہو جانا پڑے۔“

”تم ویسے بھی زیادہ نرم تو نہیں ہو۔ خدا جانے تانے کی ہو یا لوہے کی۔“

”چپ رہو۔“

”نہیں چپ رہوں گا۔ تم کیا سمجھتی ہو۔ نہ الجھرا ہو اور نہ چو میڑی۔“

”بس کرو۔۔۔ یہ بے لگی بکواس۔ جس کا نہ سر نہ سہ۔ دنیا سمجھتی ہے انور بڑا اصل مند ہے۔“

”اڑین ہے میری جوتیوں کے قفل میں بچے ہو مہیاں۔۔۔ وہ نہ جیل میں سڑتے ہوتے۔“

”رشو۔۔۔ ا۔“ انور بے یار پھرے لہجے میں بولا۔

”کیا ہے۔۔۔؟“ رشیدہ کے لہجے میں جھلک تھی۔

”تم اپنی جوتیاں چھوڑ کر فوراً میرے کمرے سے نکل جاؤ۔“

”کیا مطلب۔۔۔ ا۔“

”اگر تمہاری جوتیاں میری کامیابیوں کی شاخیں ہیں تو مجھے قطعی تمہاری ضرورت نہیں۔“

تمہاری جوتیاں ہی کافی ہیں جو فضول دائیں بائیں کر کے وقت نہیں ضائع کرتیں۔“

”میں پھر کہتی ہوں کہ تم مج سے پہلے ان کمروں سے باہر نہیں نکل سکتے۔“

”آخر تم اتنی ضدی کیوں ہو گئی ہو۔“

”معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری عقل کہیں جڑے گئی ہے۔ تم اتنا بھی نہیں سوچتے کہ وہ لڑکی جو تمہیں پروفیسر کے مکان کی کنجیاں تک دے سکتی ہے جو اتنا جانتی ہے کہ آج رات بھر پروفیسر کا مکان خالی رہے گا اس نے خود ہی یہ کام کیوں نہ سرانجام دے ڈالا۔ آخر خواہ مخواہ تمہیں سچ میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔“

”میں بھی اسی الجھن میں ہوں۔“ انور سنجیدگی سے بولا۔

”اور اس کے باوجود بھی تم وہاں جانے کے لئے تیار ہو۔“

”اگر تم مجھے کوئی مشورہ نہیں دے سکتیں تو یہاں سے چلی جاؤ۔“

”ارے! تو کیا میں اتنی دیر سے جبک مار رہی تھی۔“

”حلقی جبک مار رہی تھیں۔ مشورے آدھی اور طوفان کی طرح نہیں دیئے جاتے۔“ اور

ضرورت سے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ بولا۔ ”واقعات سننے کے بعد ہی تم نئی طرح برس پڑیں اور مجھے بھی تاؤ آ گیا۔ میں اسی چر کے متعلق تم سے گفتگو کرنا چاہتا تھا کہ آخر وہ لڑکی خود ہی اس پتھر کو اس کے مالک تک کیوں نہیں پہنچا دیتی۔“

ریشید خاموش ہو گئی۔ شاید اسے خود اپنے رویے پر انہوس ہو رہا تھا تو ڈی دیر بعد وہ

بولی۔ ”مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تمہیں پھانسا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ یہاں کے

مجرم ہی نہیں بلکہ پولیس والے بھی تمہارے دشمن ہیں۔ تمہیں ہر وقت محتاط رہنا چاہئے۔“

انور نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ وہ تھوڑی دیر بعد آہستہ سے بولا۔

ریشید کے چہرے سے فکر مندی اور جھلاہٹ کے سارے آثار غائب ہو گئے۔

”سنو رشو.....!“ انور سنجیدگی سے بولا۔ ”یہ پتھر بہت قیمتی ہے بلکہ بعض جوہری تو یہاں

تک کہتے ہیں کہ ابھی تک اس کی کوئی قیمت ہی متعین نہیں ہو سکی۔ شاید اب سے دو سال پہلے میں

نے ایسے ہی ایک سیاہ پکھراج کے متعلق اخباروں میں پڑھا تھا۔ مدراس کے کسی جوہری کے

یہاں چوری ہوئی تو اس کے یہاں سے ایک سیاہ پکھراج بھی چرایا تھا۔ جوہری کو جب یہ معلوم

ہوا کہ سیاہ بکھراج بھی چرا لیا گیا ہے تو اس کا ہارٹ ٹل ہو گیا۔ تم خود سوچو کہ وہ چیز کتنی قیمتی ہو سکتی ہے جس کے خالق ہو جانے پر اس کا مالک حد سے کی وجہ سے مر جائے۔“
انور خاموش ہو گیا۔۔۔۔۔ اس کی آنکھیں رشیدہ کے داہنے شانے پر جمی ہوئی تھیں۔
”تو پھر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“

”یہی کہ میں یہ پھر نہ تو پروفیسر چیوری کے کمر پہنچاؤں گا اور نہ فی الحال اس لڑکی کو واپس دوں گا۔ اب میں یہ پتہ لگانے کی کوشش کروں گا کہ وہ لڑکی کون ہے اگر مجھے یہ معلوم ہوا کہ دراصل وہ مجھے بھڑانا چاہتی تھی تو پھر یہ پتہ ہماری ملکیت ہو گا کیا سمجھیں۔“
”خیال تو کچھ بُرا نہیں۔“ رشیدہ کچھ سوچتی ہوئی بولی۔ ”لیکن نہیں۔۔۔۔۔ میں تمہیں یہ پھر بھی نہ رکھنے دوں گی۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

”بس یونہی۔۔۔۔۔!“ رشیدہ نرم لہجے میں بولی۔ ”کبھی تو میری بات مان لیا کرو۔“
”تم جو کہو گی وہی کروں گا۔“ انور نے مضطرب آواز میں کہا۔ ”لیکن مجھے یہ تو دیکھنا ہی پڑے گا کہ اس سازش کی پشت پر کون ہے۔“
”میں اس کے لئے منع نہیں کرتی۔“
”تم بہت اچھی ہو۔۔۔۔۔ کچ مجھ سے بہت محبت کرتی ہو۔“
”خیر تمہیں اس کا احساس تو ہوا۔“
”مگر مجھے تم سے ذرا براہِ محبت نہیں۔“

”میں خود نہیں چاہتی کہ کوئی ٹکھنا کتا مجھ سے محبت کرے۔“ رشیدہ نے کہا اور انور کو قہر آلود نظروں سے گھورتی ہوئی قلیٹ میں چلی گئی۔

انور کے چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اس نے ایک مسگریٹ سلگائی اور ٹیل ٹیل کر پیٹنے لگا۔ دیوار سے لگا ہوا کلاک تو بجا رہا تھا مسگریٹ ختم کرنے کے بعد اس نے کپڑے اتار کر شبِ خوابی کا لباس پہن لیا اور آرام سہی پر لیٹ کر ایک کتاب پڑھنے لگا۔
گیارہ بجے اس نے بجلی بجھا دی اور آہستہ سے باہر نکل آیا۔ رشیدہ کے قلیٹ میں اندھیرا

تھا شاید وہ سو گئی تھی۔ انور اندر لوٹ آیا۔ باہر والے کمرے میں اس نے دوبارہ روشنی نہیں کی۔ اندر کے کمرے میں جا کر اس نے کپڑے پہنے اور احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا پتھر یاہر آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کیرج سے موٹر سائیکل نکال رہا تھا۔

سونا گھاٹ والی کچی سڑک سٹیشن پرچی تھی۔ آسمان پر سیاہ بادل منڈلا رہے تھے۔ رات یوں بھی تاریک تھی۔ بادلوں کی وجہ سے ستاروں کی دھندلی روشنی بھی غائب ہو گئی تھی۔ سڑک کے گرد آگ کی ہوئی جھاڑیاں شہر کی آوازوں سے گونج رہی تھیں۔ انور نے موٹر سائیکل سونا گھاٹ کے ادھر ہی ایک میل کے فاصلے پر جھاڑیوں میں چھپا دی اور پیدل چلنے لگا۔

تیسرے منزل کے تاریک آثار دور سے نظر آرہے تھے۔ نہ جانے کیوں انور کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک بہت ہی بڑے اسرار عمارت میں داخل ہوتا جا رہا ہے اور وہاں ضرور کوئی حادثہ پیش آئے گا۔ اُسے پروفیسر تیوری کا چہرہ یاد آ گیا۔ چوٹی چوٹی دھندلی آنکھیں جن کی دھندلاہٹ اپنے آپ میں سطر میں کوئی بڑا سرا چیز چھپائے ہوئے تھی۔ انور اس وقت سوچ رہا تھا کہ اس نے تار جام میں سیاہ پتھر کا تذکرہ چھیڑ کر غلطی کی تھی۔ اگر واقعی یہ پتھر پروفیسر تیوری کے یہاں سے چھپایا گیا تھا تو سیاہ پتھر کے تذکرے پر اس کا شکوک ہو جانا قطعی قدرتی امر ہے۔ پتھر کئی عداوت اس کے ذہن میں ابھر آئے جنہیں وہ سگریٹ کے گہرے کشوں سے دبانے کی کوشش کرتے لگا۔

پروفیسر تیوری کی پچھلی زندگی سے اُسے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ ویسے آج کل شہر اور اس کے قریب وجوہ کے حصوں میں وہ کافی مالدار سمجھا جاتا تھا۔ ارضیات پر اس نے دو تین کتابیں بھی لکھی تھیں اور ارضیات کے طلباء میں غیر معروف نہیں تھا۔ کسی زمانے میں یونیورسٹی میں ارضیات کا معلم بھی رہ چکا تھا۔ شہر میں اس کے دو تین بچے تھے لیکن سب کرائے پر اٹھے ہوئے تھے اور وہ خود ایک فیر آباد مقام پر اقامت گزریں تھا۔

جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا عمارت درختوں کی لوٹ میں چھتی جا رہی تھی۔ وہ چھانک کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ اُس نے چھانک کو ہلکا سا دھکا دیا اور وہ کھل گیا۔ سامنے ایک طویل روشنی تھی

جس کے دونوں طرف اونچے اونچے درخت تھے۔ وہ احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔ روش کا سلسلہ عمارت کے صدر دروازے کے سامنے ختم ہو گیا۔ چاروں طرف اندھیر اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مکان کے اندر بھی زندگی کے آثار مفقود معلوم ہو رہے تھے کسی کھڑکی یا درختھان سے بھی روشنی نہ دکھائی دی۔ انور ایک لمحہ کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر جیب سے کچیاں نکال کر انہیں آزمائے لگا۔

دروازہ کھل گیا..... اندر اندھیرا تھا..... انور نے برقی لیپ نکالا اور اس کی مدد سے باقیل انتشار روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔ وہ ایک وسیع ہال سے گزر رہا تھا۔ آگے چل کر داہنے ہاتھ پر ایک دوسرا دروازہ دکھائی دیا انور نے دوسری کچلی لگائی۔ دروازہ کھل گیا انور اندر قدم رکھنے ہی والا تھا کہ کہیں کھڑکڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ دیوار سے چپک گیا اور پھر اپنا یک اس کی قوت شامہ نے ایک خاص قسم کی خوشبو کا تجربہ کیا اس نے تسے سکود کر ایک گہرا سانس لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس خوشبو کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لینے کی کوشش کر رہا ہو۔

وہ آہستہ سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ سب سے پہلے اس کے مارچ کی روشنی دوہنی طرف پڑی۔ لڑکی کے بیان کے مطابق اسی طرف وہ شوکیں رکھا ہوا ملا جس میں وہ پتھر رکھنا تھا۔ اس میں کئی خانے تھے جن میں مختلف قسم کے پتھروں کے ننھے ننھے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے اور ہر خانے کے نیچے پتھروں کے ناموں کی چٹیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک خانہ خالی تھا جس کے نیچے ”سیاہ بکھراج“ تحریر تھا۔ انور نے شوکیں کھول کر پتھر اس میں رکھ دیا اور واپس ہونے کے لئے مڑا لیکن مارچ کی روشنی کمرے کے فرش پر پڑتے ہی یک ایک اس کے سارے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ پروفیسر تیوری زمین پر جھٹ پڑا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں خوفناک حد تک کھیل گئی تھیں۔ پھرے پر آخری وقت کی تشفی کیفیت نہ مٹنے والے نشانات چھوڑ گئی تھی۔ سر کے نیچے کافی مقدار میں خون پھیلا ہوا تھا۔ انور نے مارچ بجا دی اور کچھ سننے لگا۔ دور کہیں موٹر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ تیزی سے شوکیں کے قریب آیا اور جیب سے رومال نکال کر اسے صاف کرنے لگا۔ اس کے بعد پھر اس نے چاروں طرف مارچ کی روشنی ڈالی۔ سامنے ایک دروازہ نظر آیا جس کے پت کھلی ہوئے تھے۔ یہ شاید پروفیسر کے سونے کا کمرہ تھا۔ چمک کے سر ہانے ایک بڑے سے فریم میں کسی عورت کا فوٹو لگا ہوا تھا۔ غدو غال کے اعتبار سے یہ ایک خوبصورت عورت

کئی جاسکتی تھی۔ رحمت چاہے جیسی رہی ہو۔ اس تصویر کے علاوہ یہاں اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے آرائشی سمجھا جاسکتا۔ سامنے کی دیوار میں ایک کھڑکی تھی جو کھلی ہوئی تھی۔ انور نے متنی خیر انداز میں سر ہلایا اور تاراج کی روشنی میں کھڑکی کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس کے ہونٹ بالواسانہ انداز میں سکڑ گئے۔ لیکن یہاں وہ قائل کا پتہ لگانے تو نہیں آیا تھا۔ ہو سکتا ہے سب کچھ اُسے چھپانے کے لئے کیا گیا ہو۔ اور واپس جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ مکان کے کسی حصے میں قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔

”یہ تو بالکل اندھیرا ہے۔“ ایک آواز سنائی دی اور انور چونک پڑا۔ یہ نگہ سراغ رسانی کے انجینئر آصف کی آواز تھی۔ انور نے کھڑکی پر دونوں ہاتھ ٹیک کر دوسری طرف چلا گئے۔ چہار دیواری پھلانگتے میں اسے کوئی دقت نہ ہوئی اور وہ اب اپنی پوری قوت سے اس طرف دوڑ رہا تھا جہاں اس نے اپنی موٹر سائیکل چھپائی تھی۔

جاسوس کی دھمکی

انور تھوڑی ہی دیر سوچا تھا کہ رشیدہ نے اُسے مجبوراً مجبور کر جگا دیا۔ چہ رخ گئے تھے۔ وہ مجھبلا کر اٹھ بیٹھا۔

”کیا ہے؟“

”انجینئر آصف.....“ رشیدہ نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

”اوہ!“ انور نے لاپرواہی سے کہا اور پھر لپٹ گیا۔ ”اس سے کہہ دو کہ میں اس وقت نہیں مل سکتا۔“

”مگر میرے غصے گزرنے والے وقت کی ہے کہ تمہیں اٹھنا ہی پڑے گا۔“

”کیا...؟“

”پروفیسر تیموری کو کسی نے قتل کر دیا۔“

”میرے لئے یہ خبر بہت پرانی ہو چکی ہے۔“ انور نے لاپرواہی سے کہا اور کھٹکے کے نیچے

ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکلنے لگا۔

”لیکن کچھ اس سے بھی زیادہ چونکا دینے والی خبر ہے۔“

”کیا.....؟“

”یہ اسی سے پوچھنا..... اس نے اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں بتایا۔“

”ہوں.....!“ اور اٹھتا ہوا بولا۔ ”اُسے یہیں بلاؤ۔“

رشیہ چلی گئی اور انور نے سگریٹ سلاک کر سلیپنگ گاؤن پہن لیا۔ اسپیئر آف کرے میں داخل ہوا۔ وہ بہت زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ انور نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”کل شام کو تم کہاں تھے؟“ آصف نے پوچھا۔

”جہنم میں.....!“ انور جھلا کر بولا۔ ”تم جب بھی ملے ہو اسی قسم کے بے سرو پا سوالات کرنے لگتے ہو۔“

”ابھی جھمیں معلوم ہو جائے گا کہ میں بے سرو پا سوالات نہیں کر رہا ہوں۔“

”بک چلو.....!“ انور آہستہ آہستہ ناک سے سگریٹ کا دھواں نکالتا ہوا بولا۔

”مجھے اس وقت افسوس معلوم ہو رہا ہے کہ تم میرے گہرے دوست ہو۔“ آصف چہرے کو مغموں کا کر بولا۔

”بہتر یہی ہو گا کہ تم مرثیہ خوانی شروع کر دو اور میں ماتم کروں۔ لیکن ہاتھ میرے اور سینہ تمہارا۔“

”میں علاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ آصف سنجیدگی سے بولا۔ ”پروفیسر تیوری قتل کر دیا گیا۔“

”بڑا افسوس ہوا۔ کیا تمہارا کوئی رشتے دار تھا؟“ انور نے مصومیت سے پوچھا۔

”کل شام کو تم کہاں تھے؟“ آصف نے پھر پوچھا۔

”نار جام میں۔“

آصف اچھل پڑا اور رشیہ اُسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

”کیا کرتے گئے تھے۔“

”ایفٹ خریدنے.....!“ انور نے سنجیدگی سے کہا اور ختم ہوتے ہوئے سگریٹ سے دوسرا

سگریٹ لگانے لگا۔ پھر رشیدہ کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ ”رشتو چائے یہیں منگواؤ، شاید ابھی آصف صاحب نے بھی ناشتہ نہیں کیا۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔“ آصف نے منہ بنا کر کہا۔ ”میری صرف اتنی خواہش ہے کہ تم اس وقت مجھ سے تنہائی کی گھنگو کرو۔“

”وہ تو ہوتی ہی رہے گی۔ رشو تم جاؤ۔“ انور نے کہا اور چورچور کر کہ کر طمیان سے بیٹھ گیا۔

”تار جام میں تمہارا کیا کام تھا۔“

”تم کسی اخبار کے رپورٹر سے یہ نہیں پوچھ سکتے۔“

”اس گھنگو کی حیثیت سرکاری نہیں بلکہ دوستانہ ہے۔“ آصف نے نرم لہجے میں کہا۔

”کچھ بھی ہو..... میں اپنے اصول پر سختی سے عمل کرتا ہوں۔“

”اور اگر میں بھی اپنے اصولوں پر سختی سے عمل کرنا شروع کر دوں تو۔“

”تب تم ایک ایسے لڑکے کہلاؤ گے۔“ انور نے کہا اور دوستانہ شان بے نیازی سے آصف کی طرف دیکھنے لگا۔

”انور میں سچ کہتا ہوں کہ میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

انور خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس کی آنکھوں میں اتر کر دل کا حال جاننے کے لئے کوشش کر رہا ہو۔

”پروفیسر کہ اور کن حالات میں قتل ہوا۔ کیا اس کی لاش تار جام میں گھس پائی گئی۔“ انور نے پوچھا۔

”کیوں تم نے یہ کیوں پوچھا؟ بھلا پروفیسر تیوری کا تار جام سے کیا تعلق.....؟“ آصف نے پوچھا۔

”وہ کل مجھے تار جام میں ملا تھا۔“ انور نے کہا۔

”کیا تم اسے پہلے سے جانتے تھے۔“

”نہیں کل ہی ہم دونوں نے ایک دوسرے سے جان بچان پیدا کی تھی۔“

”اور اپنا نام غلط بتایا تھا۔“ آصف بے ساختہ بولا لیکن اس نے جس مقصد کے تحت ایسا

کیا تھا اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ وہ سمجھا تھا کہ انور اس کی معلومات پر اچھل پڑے گا۔ خوفزدہ نظر آنے لگا مگر ایسا نہ ہوا۔

انور اوجھلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”اور کچھ.....!“ وہ مسکرا کر بولا۔

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم نے اسے غلط نام کیوں بتایا تھا۔“

”تمہارے اس سوال کا جواب بعد میں دو ٹوکا پہلے تم یہ بتاؤ کہ اس کی لاش کہاں پائی گئی۔“

”اس کے گھر میں۔“

”اوہ.....!“ انور کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ کچھ سوچنے لگا۔ آصف جواب طلب

لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تم تار جام سے یہاں کس وقت آئے تھے۔“

”سات بجے۔“

”اس کے بعد کیا کرتے رہے۔“

”رشیہ سے ملا تار جام..... پھر تقریباً دس بجے سو گیا۔“

”اور آجی دیر تک سوتے رہے۔“

”میں سات بجے سے پہلے کبھی بستر نہیں چھوڑتا۔“ انور نے کہا۔ ”لیکن اس قسم کے

سوالات سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ تم خود کب سے تار جام نہیں گئے۔“

”چھ ماہ قبل کیا تھا۔“

”وہاں تم نے شہر سے تین میل احرہ کی کوئی شوروم دیکھا تھا۔؟“

”میں قطعی سنجیدہ ہوں۔“ انور نے کہا۔ ”جواہرات اور دوسرے غیر معمولی پتروں کا شوروم۔“

”کیا.....؟ تم نے کہا تھا کہ تار جام سے تین میل احرہ کی گویا کرویرا نے میں۔ دیرانے

میں جواہرات کا شوروم..... ہونہ۔“

”کیوں؟ دیرانے میں تمہیں جواہرات کا شوروم ممکنہ خیر کیوں لگ رہا ہے۔“ انور نے

کہا۔

”ہاں یہ تو بتاؤ تمہیں اس کا علم کیسے ہوا کہ کل میں تار جام گیا تھا۔“

”مجھے پروفیسر تیوری نے تار جام سے فون کیا تھا کہ انور یہاں مجھ سے پر اسرار حالات میں ملا ہے۔ میں رات کو گھر نہیں واپس جاؤں گا لہذا تم میرے مکان کی حفاظت کا کوئی انتظام کرو۔“

”تو گویا آپ مجھے پھر اور ڈاکو بھی سمجھنے لگے ہیں۔“ انور نے کہا۔

”شاید وہ تمہیں پچھتا رہا تھا۔۔۔۔۔ اور تمہارے غلط نام بتانے پر محکوک ہو گیا۔ اس کے گھر میں

بھی تو کافی جواہرات موجود ہیں۔“

”لیکن یہ بھی عجیب چیز ہے۔“ انور نے کہا۔ ”تار جام والا شوروم بھی دیرانے میں ہے

اور پروفیسر تیوری بھی شاید دیرانے ہی میں رہتا ہے۔“

”میں کل شام ہی سے ایک ضروری کام میں مشغول تھا۔“ آصف اس کی بات سنی ان سنی کر کے بولا۔ ”اس لئے میں نے پروفیسر کی بات پر دھیان نہ دیا اور ویسے بھی مجھے یقین تھا کہ تم کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتے جس سے قانونا گرفت میں آجانے کا امکان ہو۔ بہر حال میں کافی رات گئے تک مشغول رہا۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے سونا گھاٹ کا ایک پتہ رکالینا چاہئے۔ اگر پروفیسر واپس آ گیا ہوگا تو نذر امانے گا۔ میری اس کی غامبی دوستی تھی۔“ آصف خاموش ہو کر انور کی طرف دیکھنے لگا۔ انور غامبی دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔

”میں دو تین آدمی ساتھ لے کر سونا گھاٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔“ آصف نے کہا شروع کیا۔ ”تیور منزل کا چھانک کھلا ہوا تھا اور عمارت بالکل تاریک تھی۔ مجھے کچھ شبہ ہوا اور ہم اندر چلے گئے۔ صدر دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ پھر ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں پروفیسر کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ کسی نے پتھر توڑنے والے ہتھوڑے سے اس پر حملہ کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ موت ہتھوڑے کی متعدد ضربات سے واقع ہوئی۔ سر کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔“

”کیا وہ گھر میں تھا رہتا تھا۔“ انور نے پوچھا۔

”نہیں اس کے ساتھ اس کا بیکریٹری حامد بھی رہتا تھا۔ لیکن وہ کل رات کو گھر پر نہیں تھا۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

”اس کا بیان ہے کہ وہ پروفیسر سے چھٹی لے کر گیا تھا۔“

”تو پھر میرا خیال ہے کہ پروفسر خاصا احمق تھا۔“ انور نے کہا۔ ”پہلے اس نے سیکریٹری کو چھٹی دی اور پھر خود مکان اکیلا چھوڑ کر تار جام چلا گیا۔ تاکہ معمولی سا چور خفیہ سی جدوجہد کے بعد اس کے سارے جواہرات مارے جائیں۔“

”یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔“

”کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ تم سے فون پر بات کرنے والا پروفسر تیوری تھا۔“

”میں جلدی میں تھا اس لئے اُس کی طرف دھیان نہیں دے سکا اور پھر اس وقت اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔“

”سیکریٹری واپس کب آیا.....؟“

”آج چار بجے صبح۔“

”تم نے اُسے حراست میں نہیں لیا۔“

”میں اس پر غور کر رہا ہوں۔“ آصف نے کہا۔ ”لیکن تم مجھے خواہ مخواہ ادھر ادھر کی باتوں میں الجھا کر پہلو بچانا چاہتے ہو۔“

”کیا مطلب.....؟“ انور اُسے گھور کر بولا۔

”تم اس حادثے کے متعلق کچھ جانتے ہو۔“

”جو کچھ جانتا تھا میں نے بتا دیا۔“

”تم آخر یہ کیوں نہیں بتاتے کہ تم تار جام کیوں گئے تھے۔“

”میں.....“ انور تھیر ہو کر بولا۔ ”شاید تم گھاس کھا گئے ہو۔ بھلا میں تار جام کیوں جانے لگا۔“

”ابھی خود تم نے اس کا اعتراف کیا ہے۔“

”مجھے یاد نہیں۔“

”خیر لیکن یہ مت بھولو کہ پروفسر نے کل مجھے تار جام سے تمہارے متعلق فون کیا تھا تم انے دھوکا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔“

”تم نے خواب دیکھا ہوگا۔ خیر عدالت تمہارے اس خواب کو دلچسپی سے سنے گی۔ فی الحال مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تمہارے جھگے کے ہر ٹکڑے صاف اس بات کی شہادت دیں

گئے کہ کل میں دو بیجے سے دس بیجے تک ان کے ساتھ رہا۔
 ”کیا مطلب.....؟“ آصف چونک کر بولا۔

”مطلب یہ میری جان کہ وہ میری بیوی کا سالہ ہے۔“ انور آنکھ مار کر کہنے لگا۔
 ”فی الحال تمہاری کوئی دیکھی رگ میرے ہاتھ میں نہیں ہے اسلئے اسے استعمال کروں گا۔“
 ”خیر اچھا ہوا کہ تم نے پہلے ہی بتا دیا..... اس کا بھی انتظام کر لیا جائے گا۔“ آصف اٹھتا ہوا بولا۔

”اررر..... بیٹھو تا بھئی۔ رشیدہ چائے لاری ہوگی۔“
 ”میں چائے نہیں پیوں گا۔“ آصف ہونٹ سکڑ کر بولا۔
 ”تمہاری مرضی۔“ انور نے اپنے شانوں کو جنبش دے کر کہا۔
 اتنے میں رشیدہ چائے لے کر آ گئی۔

”آصف صاحب چائے نہیں پئیں گے۔“ انور شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
 ”کیوں.....؟“

”مجھ سے کہہ رہے تھے مرنے کی بولی بولو۔ میں نے مفدوری ظاہر کی اس پر بگڑ گئے۔“
 ”دیکھو انور میں بتائے دیتا ہوں۔“ آصف غصے میں اس کے آگے اور کچھ نہ کہہ سکا۔
 ”ابھی نہیں پھر کسی وقت بتا دینا۔“ انور نے لاپرواہی سے کہا اور اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلا گیا۔

”یہ کسی دن بڑی مصیبت میں پھنس جائے گا۔“ آصف نے رشیدہ سے کہا۔
 ”میری بلا سے۔“ رشیدہ منہ بنا کر بولی۔ ”مگر میں تو یہ دیکھتی آرہی ہوں کہ یہ ہمیشہ دوسروں ہی کو مصیبت میں پھنسا دیتا ہے۔“

”کب تک..... خبر کی ماں کب تک بکرے کی..... کہنے کا مطلب یہ کہ بکرے کی ماں کب تک خیر نہائے گی۔“

”بہر حال میں آپ کے لئے بھی چائے لائی ہوں۔“ رشیدہ مسکرا کر بولی۔
 ”تم اسے سمجھاؤ۔“ آصف نے بیٹھے ہوئے۔

”یہ میرے بس کا روگ نہیں..... لیکن معاملہ کیا ہے۔“

”وہ پروفیسر تیوری کے قتل کے سلسلے میں کوئی اہم بات جانتا ہے۔“

”یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”میں اسے عرصے سے جانتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح اس کا اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ کب

اوٹ پٹانگ باتیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔“

اتنے میں انور بھی واپس آ گیا۔ اس نے آصف کی گفتگوں کی قحی لین وہ کچھ بولا نہیں۔

تینوں خاموشی سے چائے پی رہے۔

”ہتھوڑے پر کسی قسم کے نشانات بھی ملے یا نہیں؟“

”نہیں.....“

”ہاں میں نے رومال سے اس کا دستہ صاف کر دیا تھا۔“ انور مسکرا کر بولا۔

آصف نے چہرہ کرا سے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور رشیدہ بھی اسے سمجھنے لگی۔

”دیکھو میاں آصف میں اپنا الوسیڈ حاصل کرنے کے بعد الٹا الٹا تمہارے حوالے کر دوں گا۔

مجھے اپنا بہت سا قرض ادا کرنا ہے۔ اس کے علاوہ بینک بیلنس بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔ وغیرہ

وغیرہ..... اگر تم میرے پیچھے پڑنے کے بجائے اپنا کام دیکھو تو زیادہ اچھا ہوگا۔“

ایک مرد ایک عورت

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”میرا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تمہارے ہاتھ میں تاش کے دو پتے ہیں۔ پہلا کلن اور

دوسرا سیکریٹری۔ مہری ساتھ مغز مارنے سے بہتر تو یہی ہے کہ تم انہیں کریدنے کی کوشش کرو۔“

”مشورے کا شکریہ۔“ آصف ناخوشگوار لہجے میں بولا۔

”ایک چیز اور.....!“ انور نے آہستہ سے کہا۔ ”پروفیسر نے تم سے کہا تھا کہ وہ تار جام ہی

میں رات گزارے گا..... پھر واپس کیوں آ گیا۔“

”ممکن ہے بعد کو اسے خیال آیا ہو مگر سیکریٹری بھی موجود نہیں اس لئے گھر اکیلے نہ چھوڑنا چاہئے۔“ آصف نے کہا۔

”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اس نے تاج رام جانے سے پہلے ہی سیکریٹری کو بھیج دیا؟“

”ممکن ہے۔“

”اس لئے مجھے بھر کھانا پڑے گا کہ پروفیسر یا تو فرشتہ تھا یا بہت بڑا اجتنی کیونکہ تینوں منزل کا محل وقوع ایسا ہے کہ وہاں دن دن ہاڑے چوری ہو سکتی ہے۔“

ابھی سلسلہ گفتگو یہیں تھا کہ ایک پستہ قدم مگر مضبوط جسم کا آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے سفید سلک کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ قمیض کا سخت کارڈ وہ کی طرح سفید اور بے داغ تھا۔ کتھی رنگ کی سپاٹ ٹائی پہنے پر لہرا رہی تھی۔ آنکھوں پر سنہرے فریم کا سبک سا چشمہ تھا۔

”تو میں بالکل ٹھیک وقت پر آیا۔“ وہ مسکرا کر ایک کرسی پر بیٹھا ہوا بولا۔ پھر رشیدہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ”عالبا چائے دانی خالی نہ ہوگی۔“

انچکڑا آصف نے اسے گھور کر دیکھا۔ عاَلبا اُسے اس کی بے تکلفی کا گوارا گزری تھی۔

”میں آپ لوگوں کی مشغولیت میں غل تو نہیں ہوا۔“ وہ آصف اور انور کی طرف دیکھ کر بولا۔

”دقلمی نہیں۔“ انور نے زہریلی مسکراہٹ کیا تھا کہا۔ ”آپ سے کیا پردہ غل شہنشاہوں

کے شاہی محلات میں خوبہ سراؤں کو پوری پوری آزادی تھی۔“

آنے والا رشیدہ کی طرف دیکھ کر بے ڈھنگے پن کے ساتھ ہنسنے لگا۔ رشیدہ اٹھ کر دوسرے

کمرے میں چائے کی پیالی لینے چلی گئی۔ آصف ابھی تک اُسے گھورے جا رہا تھا۔ ایسا معلوم

ہو رہا تھا جیسے وہ اس کی موجودگی پسند نہیں کرتا۔ آصف اُس سے جھجھکتے ہوئے تھا اور اس کی وجہ اس

کے پیشے کی گندگی تھی۔ وہ روزنامہ ”پوسٹ مارٹم“ کا ایڈیٹر تھا۔ اس کی آدمی کا واحد ذریعہ بلیک

میلنگ تھی وہ اپنے اخبار کے ذریعے اونچے طبقے کے لوگوں کے پرائیویٹ معاملات پبلک کے

سامنے لا کر یا لانے کی دیکھی دے کر خاصی رقمیں پیدا کر لیا کرتا تھا۔ لیکن اس کا طریقہ کار کچھ ایسا

تھا کہ وہ براہ راست قانون کی زد میں نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ خواہ مخواہ کسی بڑے

آدمی کے پیچھے پڑ جاتا اور انور سے بھی وہ اسی مقصد کے تحت ملتا رہتا تھا کہ شاید اُس سے اُسے

کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جسے وہ اپنی آمدنی کا ذریعہ بنا سکے۔ ویسے وہ انور سے ڈرتا بہت تھا۔ اس خوف کی وجہ انور کی غیر معمولی ذہانت اور فطری بے پروائی تھی۔

رشیدہ کی واپسی پر وہ کرسی سے ٹپک لگا کر بیٹھ گیا اور رشیدہ اس کیلئے چائے اٹھالینے لگی۔

”کیوں قدیر.....؟ کوئی نئی چیز.....؟“ انور نے اس سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ اسٹیکر صاحب تمہیں کوئی نئی خبر ہی سنائے آئے ہیں۔“ قدیر مسکرا کر بولا۔

”اچھا ابھی اب میں چلوں۔“ آصف اٹھا ہوا بولا۔ ”آج شاید دن بھر میں سونا گھاٹ پر

ہی رہوں اگر فرصت ہو تو اس طرف بھی چلے آنا۔“

”کوشش کروں گا۔“ انور نے کہا اور سگریٹ سلکانے لگا۔

”میں جانتا ہوں کہ آصف تم سے مدد لینے آیا تھا۔“ قدیر بولا۔

”مجھے تمہارے اس جاننے پر کوئی اعتراض نہیں۔“ انور نے لاپرواہی سے کہا اور خیالات

میں ڈوبا ہوا ناک سے آہستہ آہستہ سگریٹ کا دھواں نکالنے لگا۔

”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ پروفیسر تیجوری کا سیکریٹری کل رات کو کہاں تھا۔“

”کہاں.....؟“ انور چونک کر بولا۔

”ابھی یہ نہیں بتا سکا اگر ان لوگوں سے سوا تلے نہ ہو تو میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔“

”کن لوگوں سے۔“

”ابھی کس طرح بتا سکتا ہوں۔“

”خیر ہوگا..... میں تمہاری تجارت میں دخل انداز نہیں ہونا چاہتا۔“ انور اٹھا ہوا بولا۔ ”میں

اس وقت بہت زیادہ مشغول ہوں۔“

”کوئی بات نہیں اتم چا سکتے ہو..... میں رشیدہ صاحبہ سے غپ لڑاؤں گا۔“ قدیر نے کہا۔

”میں معافی چاہتی ہوں..... مجھے بھی ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے۔“

”خیر خیر..... نہ جانے کیوں مجھے آپ لوگوں سے اتنی محبت ہو گئی ہے۔“

”شکریہ شکر یہ.....“ انور منہ سکڑ کر بولا۔

قدیر اٹھ کر چلا گیا۔

”تم کب بڑی اہم ہو۔“

”کیوں.....؟“ رشیدہ جھک کر بولی۔

”تمہیں اُسے روک کر اُس سے سب کچھ انکوار لینا چاہیے تھا۔“

”میں نہیں پڑتی اس پکڑ میں۔“

”خیر ہوگا.....!“ انور نے جیب سے کانڈ کا ایک ٹکڑا نکال کر اُسے دیتے ہوئے کہا۔ ”اس

نمبر کی کار کے مالک کا پتہ لگتا ہے۔“

”پھر تم نے وہی شروع کیا۔“

”جان سن! انور بڑی طرح پھنس گیا ہے۔ کل رات کو اگر مجھ سے ذرا سی بھی غفلت

ہو جاتی تو آصف مجھے لاش کے سر ہانے ہی پکڑ لیتا۔“ انور نے کہا اور پچھلی رات کی داستان

دہراتا ہوا بولا۔ ”اب میرا بھی وہی خیال ہے جو تمہارا تھا کہ مجھے کوئی پھنسا چاہتا ہے۔“

”ابھی کیا ہے۔“ رشیدہ بزرگانہ انداز میں بولی۔ ”ابھی اور دھکے کھاؤ گے خیر اب تو کچھ نہ

کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ لاؤ کانڈ مجھے دو۔“

تھوڑی دیر کے بعد دونوں آفس چلے گئے۔ رشیدہ کو چھٹی دلا کر انور اپنے روزانہ کے

کاموں میں مشغول ہو گیا۔ کلاک نے گیارہ بجائے اس نے کانڈزات ایک طرف رکھ دیئے اور

کچھ سوچنے لگا۔ آج ایک بیجے کے بعد اُسے کل والی پراسرار لڑکی سے ملنا تھا لیکن اسے سو فیصدی

یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ دوبارہ نظر نہ آئے گی۔ آخر وہ کون تھی؟ کیا اس پتھر ہی سے پروفیسر کی

موت کا تعلق تھا۔ اگر ایسا تھا تو وہ درمیان میں کیوں ڈالا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے اور پروفیسر

کے کسی پراسرار تعلق کے امکانات پر غور کرنے لگا۔ لیکن یہ چیز بالکل ہی مہمل تھی۔ پھر اچانک

اُسے اس پتھر کا خیال آ گیا۔ اس نے ٹیلی فون کا ریسورٹ اٹھایا اور نمبر ملانے لگا۔

”ہیلو..... اوه صاف کیجئے گا۔ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔“ انور نے ریسورٹ رکھ دیا اور ٹیلی فون

ڈائریکٹری اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اسے پروفیسر تیموری کے فون نمبر کی تلاش تھی۔

چند لمحوں کے بعد اس نے پھر ریسورٹ اٹھالیا۔

”ہیلو..... کیا آپ پروفیسر تیموری کے گھر سے بول رہے ہیں۔ اچھا اچھا..... ذرا انکسٹر

آصف صاحب کو فون پر بلا دیجئے۔" وہ خاموش ہو کر بائیں ہاتھ سے میز پر رکھے ہوئے کاغذات کو اٹکنے پلٹنے لگا۔ "ہیلو آصف! میں بول رہا ہوں..... کوئی نئی بات.....؟ آخر اس قتل کا مقصد کیا ہو سکتا ہے..... کوئی چیز غائب بھی نہیں ہوئی..... یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو..... جواہرات بھی بدستور ہیں؟ سیکرٹری سے تو پوچھو..... اچھا یہی اسی کا بیان ہے..... خیر میں تم سے کسی وقت وہیں لوں گا۔"

انور ریسیور رکھ کر پھر اپنے دفتری کاغذات میں ڈوب گیا۔ تقریباً ساڑھے بارہ بجے رشیدہ واپس آئی۔

"خیر.....؟" انور اس کی طرف دیکھ کر سوالیہ انداز میں بولا۔

"خیر تو ہے مگر بتاؤں گی نہیں۔" رشیدہ نے تنبیہ کی سے کہا۔

"رشتہ.....؟" انور پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"ہرگز نہیں..... ایک شرط ہے۔"

"کیا.....؟"

"دونوں کان پکڑ کر مرنے کی بولی بولو۔"

"قریب آؤ..... زور سے نہیں بولوں گا....." انور نے رشیدہ کے کان مضبوطی سے پکڑ لئے

اور آہستہ سے بولا۔ "گھڑوں کوں" اور پھر ہلکا دے کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔ رشیدہ کھڑی بسورتی رہی اور وہ کھستار ہا۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے وہ اب اس سے کچھ نہ پوچھنے گا..... لیکن جیسے ہی وہ جانے کے لئے مڑی انور آہستہ سے بولا۔

"ادھر آؤ....."

رشیدہ پلٹ کر اسے گھورنے لگی۔

"اچھا آؤ اب تم میرے کان پکڑ لو..... آ جاؤ..... شائش۔"

"نہیں آؤں گی..... نہیں آؤں گی۔" رشیدہ جھلا کر بولی۔

"تو مجھے ہی آنا پڑے گا۔"

انور اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ رشیدہ تھوڑی دیر تک اسے گھورتی رہی پھر بولی۔

"میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

”بولو بھی رشو.....“ انور چکانے انداز میں بولا۔ ”میں بالکل یہ نہیں سمجھا تھا کہ تم سنجیدی

سے میرے کان پکڑنا چاہتی ہو۔“

”یکومت.....!“

”اچھا بوجھ ہو گیا۔“

”وہ پروفیسر تھوری کی کار کا نمبر تھا۔“ رشیدہ نے کہا۔

”مذاق مت کرو۔“

”میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ پروفیسر کے پاس دو کاریں تھیں ایک وہ خود اپنے استعمال

میں رکھتا تھا اور دوسری سیکرٹری کے پاس رہتی تھی۔ یہ سیکرٹری ہی والی کار کا نمبر ہے۔“

”میرے خدا.....!“ انور آہستہ سے بولا۔ ”تو کیا..... وہ پھر سیکرٹری ہی نے چرایا تھا۔ مگر

نہیں یہ ناممکن ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اُسے دوبارہ واپس کرنے کیلئے دوسرے سے مدد کیوں لیتا۔“

رشیدہ خاموش ہو گئی۔ انور پھر بولا۔

”رشو اس لڑکی کا پتہ لگانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔“

”ہوگا.....!“ رشیدہ بے غلطی ظاہر کرتی ہوئی بولی۔

انور نے کھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک ننگا رہا تھا۔

”رشو.....! تم پھر کسی وقت میرے کان پکڑ لیتا۔ فی الحال میرے ساتھ چلو۔“ انور اُسے

دروازے کی طرف گھسیٹا ہوا بولا۔

”کہاں.....؟“

”جہاں میں چلوں۔“

انور پھر انوری موٹر سائیکل سڑک پر نرٹائے مہرنے لگی۔ رشیدہ کیریز پر بیٹھی ہوئی تھی۔

”تم مدینہ ہوٹل کے سامنے ہی ٹھہری رہتا۔ غالباً میرا مطلب سمجھ گئی ہوگی۔ تمہیں اس لڑکی

کا تعاقب کر کے یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کون ہے۔“

”ہوں..... اور اس کی اجرت.....!“

”اجرت.....!“ انور چونک کر بولا۔ ”ایک بہت ہی لذیذ قسم کا چائے۔“

رشیدہ نے اس کی پیٹھ پر گھونسا چڑایا اور وہ ایک گہرا گہرائی میں جھٹکتے ہوئے دیکھنے لگی۔
 ہونٹوں کے کچھ فاصلے پر انور نے منہ سا نکال رکھا اور رشیدہ اتر کر دوسرے کنارے کے
 فنٹ پاتھ پر چلی گئی۔

انور تاک بھونک رہا تھا۔ وہاں ہونٹوں میں داخل ہوا۔ مہینہ کیچن میں ایک آدمی بیٹھا چائے پی رہا
 تھا۔ انور دروازے پر ٹھک گیا۔

”کیا آپ مسٹر انور ہیں؟“ آدمی آہستہ سے بولا۔

انور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”چلے آئیے.....!“ وہ بولا۔

یہ ایک دبلا پتلا اور دراز قد آدمی تھا۔ گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے
 عیاری کیچتی تھی۔ چہرے کا پیکا پیکا تانے جیسا رنگ تھا کہ وہ بہت زیادہ شراب پیئے کا
 عادی ہے۔ انور اس کے سامنے بیٹھ کر اسے گھورنے لگا۔

”وہ کتھیاں دے دیجئے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”کتھیاں.....!“ انور نے تعجب ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”کبھی کتھیاں..... میرا خیال ہے
 کہ میں اس سے قبل کبھی آپ سے نہیں ملا۔“

”وہی کتھیاں جو کل ایک لڑکی نے آپ کو دی تھیں۔“

”لڑکی..... آپ شاید نئے میں ہیں۔“

”میں قطعی ہوش میں ہوں اور کتھیاں واپس لے کر جاؤں گا۔“ اس نے انور کو گھورتے
 ہوئے کہا۔ ”آپ اپنی اجرت بتائیے۔“

”کبھی اجرت..... دیکھئے جناب میں اجنبیوں سے بے تکلف ہونے کا عادی نہیں۔“

”سیدھے ہو جاؤ میاں لڑکے سیدھے۔“ وہ تن کر بولا۔ ”میں بہت بُرا آدمی ہوں۔“

”وہ تو صورت ہی سے ظاہر ہے۔“

”انور.....!“

”یہ تمہیں.....!“ انور تیز لہجے میں بولا۔ ”انور صاحب کہو۔“

”اچھا انور صاحب کچیاں واپس کر دیجئے۔“ وہ نرم لہجے میں بولا۔

”ناممکن! ہرگز نہیں۔“ انور اٹھ کر کیمین سے نکل آیا۔

”جسہیں بچھتا پڑے گا۔“ وہ بولا۔

”اس پر پھر کبھی غور کروں گا۔“ انور نے کہا اور چل پڑا۔ وہ آہستہ آہستہ قریب کے ریسٹوران کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا اشارہ پا کر رشیدہ بھی اس کے پیچھے ہوئی تھی۔ ریسٹوران میں پہنچ کر وہ اس کی طرف مڑا۔

”رشتہ..... وہ نہیں آئی۔ اس کے بجائے ایک مرد آیا ہے۔ تم اس کا پتہ چھا کرو..... وہ ابھی

اسی ہوٹل میں بیٹھا ہے۔ کیمین نمبر پانچ میں..... جاؤ جلدی کرو۔“

”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ رشیدہ بولی۔

”جاؤ میں تمہاری طرف سے بھی کھالوں گا..... مطمئن رہو۔“

رشیدہ منہ پٹاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ انور دروازے کے قریب ہی کی ایک میز پر بیٹھ گیا۔ کافی کا آرڈر دے کر اس نے سگریٹ سلگایا اور سامنے رکھے ہوئے گلدان پر نظریں جمادیں۔ لیکن اس کی یہ محبت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے ہاتھیں گال کے قریب سے ایک پیلے رنگ کی لہر گزر گئی ہو اور ساتھ ایک خاص قسم کی خوشبو..... ایک عورت پہلے رنگ کی ساری میں لمبوں کا دستر کی طرف چارہی تھی۔ لیکن وہ خوشبو! وہ خوشبو انور کا ذہن جھنجھلا اٹھا اور جیسے ہی وہ عورت کا دستر پر دونوں ہاتھ ٹیک کر پیچھے کی طرف مڑی انور کے سارے جسم میں ٹھنڈی ٹھنڈی لہریں دوڑ گئیں۔ یہ تو وہی تھی بالکل وہی جس کی تصویر اس نے پچھلی رات کو پروفیسر کی خواب گاہ میں دیکھی تھی اور وہ خوشبو۔ کیا اسی خوشبو نے پچھلی رات کو اس کا ذہن پرانہ نہ نہیں کر دیا تھا۔ پروفیسر کے مکان کا سناٹا اور اندھیرا اُسکے ذہن میں آہستہ آہستہ بگڑنے لگا۔ وہ کچھ پریشانی سی نظر آ رہی تھی۔ ہارمین نے اس کی طرف وہ گلاں بڑھا دیا جس میں اس نے پہلے رنگ کی شراب کا ایک گپک اٹھا لیا تھا۔ عورت نے سوڈے کی بوتل گلاں میں خالی کر دی اور پھر اس نئی طرح گلاں پر ٹوٹ پڑی جیسے وہ بہت پیاسی ہو۔ گلاں ختم کرنے کے بعد وہ ایک خالی میز کی قریب بیٹھ گئی۔ بار منڈر دوسرا گلاں اور سوڈے کی بوتل اس کی میز پر رکھ کر چلا گیا۔

اب وہ شراب کو بے تحاشہ طلق میں اڑیل لینے کی بجائے ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہی تھیں۔ پھر اس نے ایک سگریٹ سلاکایا اور نیم وا آنکھوں سے گھاس کی طرف دیکھنے لگی۔

اتنے میں میرا انور کی کافی لے کر آ گیا۔ انور نے عورت کی میز کی طرف اشارہ کیا۔ میرے نے کافی کی ٹرے اس میز پر رکھ دی۔ عورت میرے کو گھورنے لگی۔

”میں نے کافی تو نہیں منگوائی۔“ وہ حیرت سے بولی۔ لیکن اس کے ہیرا کچھ کہتا انور اس کے قریب پہنچ گیا۔

”میں اس وقت کافی ہی پیتا ہوں۔“ انور نے آہستہ سے کہا اور کرسی ٹھیکٹ کر بیٹھ گیا۔

”مگر آپ.....؟“ عورت کے لہجے میں احتجاج تھا۔

”ہاں..... آں.....!“ انور نے میرے کو جانے کا اشارہ کر کے کہا۔ ”میں آپ کے لئے ابھی ضرور ہوں مگر آپ میرے لئے نہیں۔“

”میں نہیں سمجھی۔“

”بات یہ ہے کہ پروفیسر تیموری.....!“

”جی.....!“ شراب کے گھاس کو اس نے اتنی مضبوطی سے پکڑ لیا کہ اس کے ہاتھ کی رگیں ابھر آئیں۔

”مطلب یہ کہ آپ پروفیسر تیموری کی دوست تھیں۔“

”جی ہاں..... جی ہاں.....!“ وہ جلدی سے بولی۔

”اُسے کسی نے قتل کر دیا۔“

”اوہ..... جی ہاں..... میں نے اخبار میں پڑھا ہے۔“

”اس سے آپ کب ملی تھیں۔“

”لیکن آپ کون ہیں؟“

”پروفیسر تیموری کا ایک ہمدرد.....!“ انور نے کہا۔ ”میں آپ سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ آخری بار اس سے کب ملی تھیں۔“

”مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ ہو سکتا ہے دس روز قبل..... ہو سکتا ہے پندرہ روز قبل۔“

”اور کل رات کو.....!“

عورت دفعتاً چمک پڑی۔ وہ انور کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”بولے بولے.....!“ انور سر ہلا کر بولا۔ ”میرے پاس اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے

کہ آپ کل رات کو تیمور منزل میں تھیں۔“

”نہیں..... نہیں..... یہ جھوٹ ہے۔“ وہ اس طرح بولی جیسے خواب میں بول رہی ہو۔

”یہ سو فیصدی سچ ہے۔“

عورت اُسے تھوڑی دیر تک خوفزدہ نظروں سے دیکھتی رہی پھر دفعتاً سنبھل کر بولی۔

”اگر آپ دوسری بار یہ جملہ دہرائیں گے تو میں پولیس کو فون کر دوں گی۔“

”ضرور سمجھئے..... اس طرح پولیس کو آسانی ہو جائے گی کیونکہ وہ خود آجکی تلاش میں ہے۔“

سیکرٹری

عورت پھر خوفزدہ نظر آنے لگی۔

”لیکن ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ

کل رات کو تیمور منزل میں تھیں یا نہیں۔“

”قطعاً نہیں..... ہرگز نہیں۔“

”خیر آپ کی مرضی.....!“ انور لاپرواہی سے بولا۔ ”لیکن اپنا نام بتانے میں تو آپ کو کوئی

اعتراض نہ ہوگا۔“

”گھور یا تم کوئی.....!“

انور نوٹ بک نکال کر لکھنے لگا۔

”کہاں رہتی ہیں۔“

”میں لاج..... تیسری منزل..... روم نمبر پانچ۔“

”شکریہ۔“ انور نوٹ بک جیب میں رکھتا ہوا بولا۔

”لیکن..... لیکن؟“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”کیا.....؟“

”کچھ نہیں۔“

”آپ کی مرضی۔“ انور لاہروائی سے بولا اور کافی کی پیالی خالی کر کے کرسی کی پشت سے

ٹک گیا۔

وہ انور کو بخور دیکھتی رہی۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولی۔

”میں اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتی۔ میری ہی طرح پروفیسر کے درجنوں جان بچان

والے ہوں گے۔ پولیس ان سب کو ٹھک کرے گی؟“

”جان بچان بھی کئی قسم کی ہوتی ہے۔“ انور نے کہا۔ ”ایک قسم یہ بھی ہوتی ہے کہ لوگ

جان بچان والوں کی تصویریں اپنی خواب گاہوں میں لگاتے ہیں۔“

”جی.....!“ عورت چونک کر بولی۔

”جی ہاں.....!“ انور معنی خیز انداز میں بولا۔ ”پولیس آپ میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی

لے رہی ہے۔“

”لیکن آپ کون ہیں۔“

”کہہ تو دیا کہ پروفیسر کا ایک دوست..... میرا پولیس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں چاہتا ہوں

کہ آپ سب کچھ مجھے بتا دیں تاکہ میں آپ کو پولیس کی زیادتی سے بچا سکوں۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔“ عورت جلدی سے بولی۔ ”اور آپ مجھ پر سراسر اتہام لگا رہے ہیں

کہ میں کل رات کو پروفیسر تیموری کے مکان میں تھی۔“

”خیر..... خیر..... دیکھا جائے گا۔“ انور اٹھتا ہوا بولا۔ ”میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ

پولیس کو آپ تک نہ پہنچے دوں۔“

انور نے گاؤنٹری پر جا کر مل ادا کیا اور ریستوران سے نکل گیا۔

رشیدہ کا انتظار فضول تھا۔ معلوم نہیں وہ کب تک واپس آئے۔ انور کچھ سوچنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی موٹر سائیکل سونا گھاٹ کی طرف جاری تھی اور اس کا ڈھن کئی گھنٹیاں

لمحانے کی کوشش کر رہا تھا۔

تیور منزل میں پولیس ڈیرا ڈالے ہوئی تھی۔ انسپکٹر آصف بھی موجود تھا اور بہت زیادہ شکر نظر آ رہا تھا۔ انور کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل گیا۔

”میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

”کوئی نئی بات۔“

”کچھ نہیں..... کوئی نئی بات نہیں۔ میں نے عکس کو حراست میں لے لیا ہے۔“

”کیوں.....؟“

”شب کی عشاء پر..... واقعی اس کا شوروم اچھائی پر اسرار معلوم ہوتا ہے۔“

”لیکن صرف اسی کو حراست میں کیوں لیا ہے۔“

”میں تار جام گیا تھا۔“ آصف کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”عکس کی کل رات کی نقل و حرکت بے

میں ڈالنے والی ہے۔“

”یعنی.....؟“

”وہاں سے پروفیسر تیوری کی روانگی کے تھوڑی دیر بعد ہی وہ بھی چل پڑا۔“

”پھر.....؟“

”ظاہر ہے کہ اگر اُسے بھی شہر آنا تھا تو وہ پروفیسر تیوری ہی کے ساتھ کیوں نہیں آیا۔“

تھوڑی دیر بعد چلنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے اور پھر دوسری بات یہ کہ اُس نے عام راستے کے

بجائے دشوار گزار راستے اختیار کئے جن کے ذریعہ وہ پروفیسر سے کچھ دیر قبل ہی شہر پہنچ گیا تھا۔“

”لیکن تمہیں یہ اطلاعات ملیں کہاں سے۔“ انور نے کہا۔

”اس جیسی ڈرائیور سے جو اُسے شہر لے گیا تھا۔“

”ہوں.....؟“ انور کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”وہ اترا کہاں تھا۔“

”جن لاج کے قریب۔“

”جن لاج.....؟“ انور چونک کر بولا۔

”ہاں..... لیکن تم چو کئے کیوں؟“

”کچھ نہیں..... یونہی..... تو پھر گولس نے کیا بتایا۔“

”ظاہر ہے کہ وہ آسانی سے یہ نہیں بتائے گا کہ وہ تیوری کا قاتل ہے۔“

”بھئی کمال کر دیا۔ محض اتنی سی بات پر تم نے اسے قاتل ہی تسلیم کر لیا۔“ انور فیس کر بولا۔

”نہیں اس کی وجہ ایک اور بھی ہے جس ہتھوڑے سے پروفیسر قتل کیا گیا تھا وہ عام استعمال

کا ہتھوڑا نہیں۔ یا تو وہ پروفیسر ہی کا ہو سکتا ہے یا پھر اسی کے کسی دوسرے ہم پیشہ کا۔“

”تمہاری مراد پھر توڑنے والے ہتھوڑے سے ہے؟“ انور نے پوچھا۔

”ہاں..... سیکرٹری نے بتایا کہ وہ پروفیسر کا نہیں تھا۔“

”تو کیا گولس نے اُسے اپنا ہتھوڑا تسلیم کر لیا۔“

”بھلا وہ کیوں تسلیم کرنے لگا۔“

”تو اس سے تم نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ گولس ہی کا ہو سکتا ہے۔“ انور بولا۔

”یہ تو اب دیکھا جائے گا۔“

”پروفیسر کا قتل کہاں ہوا.....؟“ انور نے پوچھا۔

”پتھروں والے کمرے میں۔“ آصف نے کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

وہ دونوں اس کمرے میں آئے جہاں پچھلی رات کو انور نے پروفیسر کی لاش دیکھی تھی۔

اس وقت اجالے میں چادروں طرف لگے ہوئے شیشے کے شوکیوں میں طرح طرح کے خوش

رنگ پتھر جگمگا رہے تھے۔ آصف انور کو وہ جگہ دکھانے لگا جہاں پروفیسر کی لاش ملی تھی۔

”تو تمہیں اچھی طرح اطمینان ہے کہ یہاں سے کوئی چیز چرائی نہیں گئی۔“ انور نے پوچھا۔

”میں یہاں کی چیزوں سے واقفیت تو رکھتا نہیں۔“ آصف مسکرا کر بولا۔ ”سیکرٹری کا

بیان یہی ہے کہ ہر چیز اپنی جگہ پر موجود ہے۔ فی الحال مجھے اسی کے بیان پر یقین کرنا پڑے گا۔“

”ہوں.....!“ انور کچھ سوچ رہا تھا اور اس کی نظریں شوکیس پر جمی ہوئی تھیں جس میں اس

نے پچھلی رات کو سیاہ کھمرانج رکھا تھا۔ لیکن اس وقت وہ غائب تھا۔ ابکی جگہ خالی نظر آ رہی تھی۔

”سیاہ کھمرانج.....!“ انور نے شوکیس پر جبک کر بلند آواز میں کہا۔

”اوں..... کیا مطلب.....!“ آصف چونک کر بولا۔

”شاید یہاں بھی کوئی پتھر تھا جس کا نام لکھا ہوا ہے۔“ انور خالی جگہ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”ہاں تھا تو..... اب وہ تجوری میں رکھ دیا گیا ہے۔“ آصف نے کہا۔

”کیوں.....؟“

”پتھر نہیں..... سیکریٹری نے رکھ دیا ہے۔“

”تمہارے سامنے۔“

”ہاں بھی ہاں۔“

”تم اس کی قیمت سے واقف ہو۔“ انور نے پوچھا۔

”کیوں یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔“

”اس لئے کہ سیاہ بکمر آج تک میری نظر سے نہیں گزرا.....؟“

”ٹھیک ہے۔“ آصف بولا۔ ”آج سے پہلے میں نے بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔“

”سیکریٹری کہاں ہے؟“

”اس کی حالت بہت اتر ہے۔“

”وہ ہے کہاں.....؟“

”اپنے کمرے میں؟“ بھی نہ جانے کیوں مجھے اس پر دم آتا ہے۔“

”اور مجھے تم پر دم آتا ہے۔“ انور ہونٹ سکڑ کر بولا۔ ”میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”وہ سامنے والے کمرے میں ہے تم جاؤ۔ میں مرحوم کے سالن کی فہرست مکمل کر رہا ہوں۔“

”مگر یہ تمہارا کام نہیں ہے۔“ انور نے کہا۔

”یہ تم بھولو کہ پروفیسر میرا دوست بھی تھا۔“

”اس کا کوئی وارث بھی ہے یا نہیں۔“

”ہے تو..... لیکن اس کے حلق پروفیسر کے قانونی مشیر مسٹر بی۔ داس زیادہ بہتر بتا سکیں

گئے۔“

”اور تم نے ابھی تک اس سے گفتگو نہیں کی۔“

”میں نے کوشش کی تھی لیکن وہ آج کل شہر میں موجود نہیں ہے۔“

”ہوں۔۔۔۔۔!“ انور نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ تھوڑی دیر تک وہ آصف کو بے خیالی میں گھورتا رہا پھر سیکریٹری کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ انور نے دنگ دی۔ جواب نہاد۔۔۔۔۔ اس نے پھر دروازہ کھینچ لیا۔ اندر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور وہ دروازہ کھل گیا۔ انور کے سامنے ایک خوبصورت جوان کھڑا تھا۔ آنکھیں سرخ اور پلکیں سوجی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کافی دیر تک روتا رہا ہو۔

”اندر چلے۔“ انور آہستہ سے بولا۔ سیکریٹری ایک طرف ہٹ گیا اور انور کمرے میں چلا گیا۔

”بیٹھے جائیے۔“ انور ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

سیکریٹری بیٹھ کر انور کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

”آپ کو یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ آپ پروفیسر سے چھٹی لے کر گئے تھے۔“

”جی۔۔۔۔۔!“ سیکریٹری اُسے غور سے نظروں سے دیکھنے لگا۔

”جی ہاں۔“

”میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”آپ یہاں سے کس وقت گئے تھے۔“

”دس بجے دن کو۔“

”کہاں گئے تھے؟“

”نشا خانہ اپنی خالہ کے یہاں۔“

”آپ کے استعمال میں وہی کار رہتی ہے جس کا نمبر ۲۲۷۱ ہے۔“

”جی ہاں۔“

”آپ اسی کار پر گئے تھے۔“

”جی ہاں۔“

”اور وہ کل سے اب تک آپ ہی کے پاس رہی۔“

”جی۔۔۔۔۔!“ وہ چونک کر بولا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”آپ میری بات کا جواب دیجئے۔“

”نہیں کل یہ میری خالہ کے بھی استعمال میں رہی۔“

”آپ کی خالہ کی عمر کیا ہے؟“

”سستر.....!“ وہ تیز لہجے میں بولا اور پھر انور کو گھورنے لگا۔

”اس سوال کا جواب ضروری ہے؟“ انور نے جھجکی سے کہا۔

”پچاس یا پچھن سال.....!“

”ہوں.....!“ انور کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”کیا آپ مکان کی کتنی اس لچھے میں رکھتے ہیں

جس میں کار کی کتنی رہتی ہے۔“

”جی ہاں.....!“

”تو کل کتنیوں کا لچھا بھی آپ کی خالہ کے پاس رہا ہوگا۔“

”جی ہاں..... مگر کیوں..... مگر کیوں؟“

”کچھ نہیں..... کوئی خاص بات نہیں۔“ انور سگریٹ سلکاتا ہوا بولا۔ ”کیا میں وہ لچھا دیکھ

سکتا ہوں۔“

”جی ہاں..... ضرور ضرور۔“ سیکریٹری نے کہا اور اپنے کوٹ کی جیبیں نٹو لئے لگا۔

”یہ لیجئے۔“

”ان میں سے مکان کی کتیاں کون کون سی ہیں۔“ انور نے پوچھا۔

سیکریٹری بتانے لگا۔

”اچھا یہ تو وہ کتیاں ہیں جو آپ کے پاس رہتی تھیں۔ وہ کتیاں کہاں ہیں جو پروفیسر رکھتا تھا۔“

”وہ ان کی جیب میں نہیں ملیں۔“ سیکریٹری بولا۔

”آپ نے تلاش کی تھیں۔“

”نہیں..... قاعدے کے مطابق انہیں ان کی جیب میں ہونا چاہئے تھا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قتل کرنے والا اپنے ساتھ وہ کتیاں بھی لے گیا۔“ انور بولا۔

”بھلا میں اس کے متعلق کیا تا سکتا ہوں۔“

”خیر چھوڑیے..... یہ بتائیے کہ آپ نے وہ سیاہ بکھراج تجوری میں کیوں رکھ دیا ہے۔“

”وہ تجویزی ہی میں رہتا تھا۔ پرسوں چند مہمانوں کو دکھانے کیلئے شوکیس میں لگایا گیا تھا۔“

”مہمانوں کو دکھانے کے لئے؟“

”جی ہاں۔“

”ان مہمانوں کے نام.....؟“

سکرٹری نے نام بتانے شروع کئے اور انور اپنی نوٹ بک میں لکھتا گیا۔

”سر مسٹر احمد.....“ انور ایک نام پر بڑبڑایا۔ ”بیشکل بیک کا ڈائریکٹر.....!“

”جی ہاں وہی۔“

”شاید وہ بھی تو پتھروں کا شوقین ہے۔“

”جی ہاں۔“

”پروفیسر سے اس کے تعلقات کیسے تھے۔“

”اچھے نامے تھے۔“

”لیکن ہم پیشہ اور ہم شوق لوگ ایک دوسرے سے حسد بھی تو رکھتے ہیں۔“ انور بولا۔

”بھلا میں اس کے حلق کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”تو وہ بکمر راج پرسوں سے آج تک اسی شوکیس میں رہا۔“

”جی ہاں۔“

انور اسے تیز نظروں سے گھورنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد کمرے سے نکل آیا۔

کچھ نئی باتیں!

چار بجے شام کو انور تیمور منزل سے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کیس میں اُسے بیج بیج سوچنے پر مجبور ہو جانا پڑا تھا۔ سکرٹری کا بیان الجھا ہوا تھا اور فی الحال کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اسے مجرم کیوں نہ سمجھا جائے۔ پتھر چرایا گیا تھا۔ لیکن وہ اس کے مطابق دھوٹ

والی رات سے اس وقت تک اسی شوکیں میں موجود رہا۔ پھر دوسری بات یہ کہ اگر وہ تجوری میں رکھا جاتا تھا تو پھر دعوت کے اختتام سے اب تک شوکیں ہی میں کیوں رکھا رہا۔ انور کو فحشوں ہو رہا تھا کہ اس نے اس سے اور سوالات کیوں نہ کئے۔ پھر اس کا ذہن گھوریا کی طرف منتقل ہو گیا۔ اُسے سو فیصد یقین تھا کہ وہ پچھلی رات کو جانے واردات پر موجود تھی لیکن اس یقین کی بنیاد کسی منطقی دلیل پر نہیں تھی جس خوشبو کا تجربہ اسے پچھلی رات کو ہوا تھا اس کا استعمال گھوریا کے علاوہ کوئی دوسرا بھی کر سکتا تھا۔ اس امکان کے باوجود بھی وہ نہ جانے کیوں گھوریا کو اس کیس سے متعلق ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ پھر اراج اسی نے جرایا ہوا اور پھر کسی وجہ سے اُسے واپس کر دینے پر آمادہ ہو گئی ہو۔ اس کام کے لئے اس نے اس لڑکی کو منتخب کیا ہو۔ لیکن نہیں..... وہ سوچنے لگا۔ اگر یہ بات حقیقی تو اس لڑکی کے پاس سکرٹری کی کار کی موجودگی کیا معنی رکھتی ہے۔ اس سے تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ خود سکرٹری بھی ملا ہوا تھا اور اگر یہ درست ہے تو پھر پتھر کی واپسی کے لئے اُسے ہموار کرنا باطل ہی امتحانہ فعل تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ خود سکرٹری ہی انجام دے سکتا تھا۔ پھر اچانک اس کا ذہن ایک دوسرے ہی دھارے پر بہہ نکلا۔ آخر پر و فسر کا قتل کیا معنی رکھتا ہے اگر یہ سب کچھ اُسے پہنچانے کے لئے کیا گیا تھا تو اس سازش کی پشت پر کون ہو سکتا ہے اور پھر سوچتے سوچتے اسے الجھن ہونے لگی اور اس نے وقتی طور پر یہ خیال دل سے نکال پھینکا۔

رشیدہ گھر پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ انور نے کمرے میں داخل ہوتے ہی فلت سیٹ اتار کر دور پیٹک دی۔ نشانہ تو میز ہی کا لیا تھا لیکن ہاتھ بہک جانے کی وجہ سے وہ جوتوں کی الماری میں جا گری۔ ٹائی کی گرہ دھسلی کر کے وہ ایک آرام کرسی میں جھنس گیا۔

”کیوں؟ کیا کسی نے مرمت کر دی؟“ رشیدہ نے جیسے ہوئے لہجے میں کہا۔

”نہیں میں کسی ایسے کی تلاش میں ہوں جس کی مرمت کی جاسکے۔“

”آئینہ لا دوں۔“ رشیدہ نے بھولے پن سے کہا اور انور اُسے گھورنے لگا۔

”رپورٹ.....“ وہ تلخ لہجے میں بولا۔

”بہت اچھا حضور..... سنئے..... وہ سے پول ہوٹل کے کمرہ نمبر ۴۶ میں رہتا ہے۔ رجسٹر

میں اس کا نام دے کر ہے ہوٹل میں لڑکی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ تموڑی دیر تک وہ اس سے کچھ باتیں کرتا رہا لڑکی خوفزدہ سی نظر آ رہی تھی۔ پھر وہ ہوٹل سے چلی گئی اور میں واپس آ گئی۔“

”تم واپس آ گئیں۔“

”اور پھر کیا کرتی۔“

”اوہ..... تم اتنی اُلوکیوں ہو گئی ہو۔“

”نہیں تو کہاں۔“ رشیدہ حیرت سے اپنا پورا جسم ٹٹولتی ہوئی بولی۔

”میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”تو میں کیا کروں۔“

”رشو.....!“

”فرما ہے مسٹر انور۔“

”مجھے غصہ آ جائے گا۔“

”تمہی بات ہے۔ بچوں کو غصے سے پرہیز کرنا چاہیے۔“ رشیدہ مریا نہ اعزاز میں بولی۔

”رشو.....!“ انور جھلا کر چیخا۔

”انور.....!“ رشیدہ بھی اسی اعزاز میں چیخیں۔

انور دانت پیسنے لگا۔ رشیدہ اس کی نقل کر رہی تھی۔

”معلوم ہوتا ہے تمہاری شامت آ گئی ہے۔“ انور نے کہا۔

”ہاں آئی تو تھی مگر تم سے ملاقات نہ ہونے پر افسوس ظاہر کر کے اپنا پتہ چھوڑ گئی۔“

”میں اپنا سر پھوڑ لوں گا۔“

”بسم اللہ..... مگر میز پر نہیں۔ کمزور لکڑی کی ہے۔ میرا خیال ہے دیوار..... خیر دیوار ہی سہی۔“

”یکو اس بند کرو۔“ انور پھر چیخا۔

”یکو اس بند کر دی۔“ رشیدہ بھی اسی اعزاز میں چیخیں اور چھت کی طرف دیکھنے لگی۔

انور نے دوسری طرف منہ پھیر لیا اور رشیدہ بلند آواز میں گانے لگی۔

”ماں مرا احسان ارے نادان کہ میں نے تجھ سے کیا ہے پیار.....!“

”ارے بڑ کرو..... بڑ کرو..... یہ نفرت آجیر گا۔“ انور زور سے چیخا۔

”کرمش نے تجھ سے کیا ہے پیار.....!“ رشیدہ نے بھرپور ہانک لگائی۔

”میں جی کہتا ہوں۔“

”مان مرا احسان.....!“

”چپ رہو۔“

”ارے نادان کر میں.....!“

... ”ارے چپ ارے چپ۔“ انور کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بولا۔ ”خدا عاقبت کرے

اے جس نے یہ گیت لکھا تھا۔ جاہل قتاوہ! کل انوکا چٹھا تھا۔“

”تجھ سے کیا ہے پیار.....!“

انور نے جھلا کر اپنی ٹانگی کی گرہ تنگ کرنی شروع کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گلا

گھونٹ کر مر جائے گا۔ نہ جانے کیوں اسے یہ گیت حد درجہ نفرت انگیز معلوم ہوتا تھا۔

”جی جی..... ہائی خوش رنگ بھی ہے۔“ رشیدہ اس کے ہاتھ پکڑتی ہوئی بولی۔

”آخر تمہیں اس گیت سے اتنی چڑ کیوں ہے۔“

”دور ہو..... دور ہو.....!“ انور اٹھتا ہوا بولا۔

”اب مجھے ان کمزکیوں میں سلاخیں لگوانی پڑیں گی۔“ رشیدہ فکر مند لہجے میں بولی۔

”معلوم نہیں کب پڑوں کے ریڈیو سیٹ پر یہی گیت آنے لگے اور تم کمزکی سے چھٹا لگادو۔“

”تم خدا کے لئے یہاں سے چلی جاؤ۔“ انور عاجز آ کر بولا۔

”میں خود ہی جا رہی تھی۔“ رشیدہ دروازے کی طرف بڑی اور تھوڑی دور جا کر پھر پلٹی۔

”جانتے ہو وہ پراسرار لڑکی کون ہے؟“

”کیوں خواہ مخواہ مجھے تنگ کرتی ہو۔“ انور کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

”اب آئے ہو سیدھی راہ پر..... خیر سنو..... اس کا نام رابعہ صفر ہے اور وہ ہر صفر احمد کی

لڑکی ہے۔“

”کیا کہا.....؟“ انور اچھل کر بولا پھر اس کی نظریں رشیدہ کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

”کیوں؟ کیا بات ہے۔“ رشیدہ نے آہستہ سے پوچھا۔
 ”بہت بڑی بات۔“ انور کی نظریں بدستور اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔
 ”مگر میں خود بخود کھلتی جا رہی ہیں۔ خود بخود کھل رہی ہیں۔“
 ”تو ٹھیک سے بتاؤ نا۔“

دفعتاً انور نے چوک کر اپنی نظریں اس کے چہرے پر سے ہٹالیں اور پھر اس طرح اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ اس کی موجودگی سے بے خبر تھا۔
 ”معاملہ بہت زیادہ الجھا ہوا ہے۔“ انور نے کہا اور رشیدہ کو اپنی اور سیکریٹری کی گفتگو کے متعلق بتانے لگا۔

”جب تو معاملہ صاف ہے۔“ رشیدہ بولی۔ ”سیکریٹری بھی ملا ہوا ہے لیکن پروفیسر کے قتل کا مقصد سمجھ میں نہیں آتا اور اب تو یہ بھی نہیں سوچا جاسکتا کہ کسی نے جنہیں پھنسانے کی کوشش کی ہے۔ بھلا سفیر احمد یا اس کی لڑکی سے تہہز کیا تعلق۔“
 ”یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔“

”ہاں ایک بات تو بھول ہی گئی۔ ایک عورت تلاش کرتی ہوئی آفس پہنچی تھی۔ اپنا نام گھوڑیا بتایا تھا۔ شاید وہ مناسب حق المحنت کے عوض تم سے کوئی کام لینا چاہتی ہے۔“
 ”گھوڑیا؟ کیوں کیا.....؟“ انور کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
 ”کیا تم اُسے جانتے ہو.....؟“

”ہاں..... میری فہرست میں وہ بھی شامل ہے۔“
 ”بہر حال وہ اپنا پتہ دے گئی ہے۔“
 ”ہوں.....؟“ انور کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر دفعتاً چوک کر بولا۔ ”میں نے ابھی تک چائے نہیں پی۔“

”لیکن میں نے سنا ہے کہ تمہارے استاد انیسٹر فریدی کھانا پینا تک بھول جاتے ہیں۔“
 ”وہ عشق کی آخری منزل ہے..... میں ابھی تک وہاں نہیں پہنچ سکا۔“
 چائے پی پکتے کے بعد وہ رٹن بلڈنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ گھوڑیا اُسے

کچھ بتانا چاہتی ہے کوئی اہم بات۔

تھوڑی دیر بعد وہ گوریہ کے فلیٹ کی کھٹی بجارہا تھا۔ دروازہ کھلا اور گوریہ چونک کر پیچھے ہٹ گئی۔

”آپ..... آپ..... کیوں؟“

”کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

”مگر اس وقت یہاں گھر میں مہمان.....؟“

”آپ مطمئن رہئے..... آپ کا مہمان محفوظ رہے گا۔“

وہ دروازہ بند کر کے واپس لوٹ گئی۔ اس کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اندر کوئی خاص انتظام کر کے انور کو بلائے گی۔ انور نے دھکا دے کر دروازہ کھول دیا لیکن سامنے نظر پڑے ہی وہ ٹھنک گیا۔ ایک معمر آدمی صوفے سے اٹھ رہا تھا۔ انور اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ سرسفر احمد تھا۔

سرسفر اپنے سر پر فلیٹ ہیٹ بھاتا اور کچھ بڑبڑاتا ہوا اس کے قریب سے گزر گیا۔

گوریہ انور کو نئی طرح گھور رہی تھی۔

”میں اس بدقیزی کا مطلب نہیں سمجھی۔“

”اور مجھے آپ کا یہ جملہ بڑا عجیب لگ رہا ہے۔“

”تم آخر ہو کون.....؟“ وہ جھجھلا کر بولی۔

”آپ تو اس طرح کہہ رہی ہیں جیسے میں زبردستی یہاں گھس آیا ہوں۔“ انور نے مسکرا کر کہا اور اپنا ملاقاتی کارڈ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”انور سعید.....؟“ وہ اچھل پڑی۔ ”مگر..... مگر.....؟“

”میں آپ کی درخواست پر یہاں آیا ہوں۔“

”اوہ..... معاف کیجئے گا۔ آپ نے پہلے ہی کیوں بتا دیا تھا۔“

”آپ نے پوچھا ہی کب تھا.....؟“

”اچھا تو بیٹھے۔ میں ایک بار پھر معافی چاہتی ہوں۔“

”کوئی بات نہیں۔“ انور بیٹھتا ہوا بولا۔

”میں آپ کی مدد چاہتی ہوں۔“

”کس معاملے میں۔“

”پولیس نے گولس کو پکڑ لیا ہے۔“

”گولس..... کون گولس.....؟“

”پروفیسر تیموری کا دوست.....!“

”لکھیں اس سے آپ کا کیا تعلق.....؟“

”میری اور اس کی شادی ہونے والی تھی۔“

”اور وہ کل رات کو یہاں آیا تھا۔“ انور نے پوچھا۔

”ہاں.....!“

”تو وہ پروفیسر کے ساتھ ہی کیوں نہیں چلا آیا تھا۔“

”وہ نہیں چاہتا تھا کہ پروفیسر کو علم ہو۔“

”کیوں.....؟“

”اب میں کیا بتاؤں۔“ وہ بے بسی سے انور کو دیکھنے لگی۔ پھر تیموری دہرے ہوئی۔ ”آپ

نے میری تصویر پروفیسر کے کمرے میں دیکھی تھی۔“

”ہاں تو پھر.....!“

”یہ سب میں نے گولس ہی کے لئے کیا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو گولس کے کاروبار کے

لئے دوپہے کہاں سے فراہم ہوتا۔ اسے بھی چھروں کا خلیہ ہے اور اس نے بھی اپنی زندگی چھروں

کے لئے وقف کر دی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور جانتا ہی نہیں۔ میں نے پروفیسر تیموری سے

اُسے قرض دلوایا تھا اور اسی سے وہ کاروبار کر رہا تھا۔ پروفیسر اس کا کاکہ بھی تھا۔“

”کیا پروفیسر کو تم دونوں کے تعلقات کا علم تھا۔“

”ہاں.....!“

”اور یہ سر مشیر احمد۔“

”یہ بھی گولس کے گاہکوں میں سے ہے۔“

”لیکن تمہارا اس سے کیا تعلق۔“

گھوڑیا خاموش ہو گئی۔ انور اُسے گھور رہا تھا۔

”کچھ بھی نہیں..... کچھ بھی نہیں۔“

”اچھا سیاہ بکھراج کے بارے میں تم کیا جانتی ہو۔“

گھوڑیا بے اختیار چونک پڑی۔ اُس کے چہرے کی رنگت اڑنے لگی تھی لیکن اس نے جلد

سنی اپنی حالت پر قابو پایا۔

”سیاہ بکھراج..... کیا سیاہ بکھراج..... میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“

”پھر میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔“

”مہر انور..... گولس کو اس مصیبت سے نجات دلائیے۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔“

”تو پھر میں جو کچھ پوچھا ہوں تم بتائی کیوں نہیں۔“

”جو کچھ میں جانتی تھی میں نے بتا دیا۔“

”تم نے کچھ نہیں بتایا۔ لیکن تم ایک دن سب کچھ بتانے پر تیار ہو جاؤ گی۔“

گھوڑیا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”کیا تم پروفیسر والی دعوت میں شریک تھیں۔“

”نہیں..... لیکن گولس وہاں موجود تھا۔“

”سر مضفر اور پروفیسر کے تعلقات کیسے تھے؟“

گھوڑیا ایک بار پھر خاموش ہو گئی لیکن اُسے بولنا ہی پڑا اور وہ کافی دیر تک ہاتھیں کرتی

رہی۔ لیکن انور کے لئے وہ سب بے سود تھیں۔ اس کی دانت میں وہ اس سے کچھ چھپانے کی

کوشش کر رہی تھی۔

وہ لڑکی

سات بجے بجے اور پھر سونا گھاٹ پہنچ گیا۔ تیمور منزل میں ابھی دو پولیس کاٹھیل تعینات

تھے۔ آصف وغیرہ جا چکے تھے۔ کانسٹیبل دوپہر کو انور اور آصف کو ایک ساتھ دیکھ چکے تھے اس لئے انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ انور سیدھا سیکرٹری کے کمرے میں چلا گیا جواس وقت بھی بند تھا۔ البتہ کمزریاں کھلی ہوئی تھیں جن سے روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ انور نے دستک دی اور دروازہ کھل گیا۔ سیکرٹری اُسے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت جھانک رہی تھی۔

”تم سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے فرصت نہیں۔“

”تم یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہاری خالہ.....!“

”آپ جا سکتے ہیں۔“ وہ بگڑ کر بولا۔ ”مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔“

انور ہنسنے لگا..... اور سیکرٹری نے دروازہ بند کر دیا۔ انور تھوڑی دیر تک کمزرا کچھ سوچتا رہا پھر کمزری کے قریب جا کر بولا۔ ”سیکرٹری صاحب آپ خواہ مخواہ ناراض ہو گئے..... مجھے رابعہ منیر نے بھیجا ہے۔“

دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھل گیا اور سیکرٹری باہر نکل آیا۔

”کس نے بھیجا ہے تمہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”تمہاری خالہ رابعہ منیر نے۔“ انور تنبیہ کی سے بولا۔

سیکرٹری دیوار سے ٹک کر کمزرا ہو گیا۔ انور نے محسوس کیا کہ وہ بغیر ہمدے کے نہیں کمزرا ہو سکتا۔

”اعتراف کرو.....!“ انور اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے بولا۔

”سیکرٹری بالکل بے بس نظر آ رہا تھا۔“

”پولیس کو ابھی اس کی اطلاع نہیں کہ تم نے پروفیسر کی اجازت کے بغیر کل رات کو گھر

چھوڑا تھا۔“

”تو کیا.....!“ وہ خوفزدہ لہجے میں بولا۔ ”رابعہ نے سب کچھ بتا دیا۔“

”تم نے پولیس سے یہ بات کیوں چھپائی تھی کہ دعوت والی رات کو سیاہ بگمراج کم ہو گیا

تھادور پروفیسر کی موت کے بعد پھل گیا۔“

”اگر رابعہ نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے تو اب مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔“

”رابعہ نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا لیکن اب تمہیں سب کچھ بتانا پڑے گا۔“

سیرکری کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”لیکن اتنا یاد رکھو کہ تم جھوٹ بول کر کامیاب نہیں ہو سکتے۔“ انور پھر بولا۔

”میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔“ سیرکری گلوگیر آواز میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر

رہے تھے۔ میں نہیں جانتا کہ پروفیسر کو کس نے قتل کیا لیکن یہ جانتا ہوں کہ پٹرکس نے چلایا تھا۔

تم کسی طرح سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرو کہ پروفیسر کا قاتل میں ہی ہوں۔ پٹرکی بات

اعتراف سے ہی میں رہنے دو۔ میں نہیں چاہتا کہ رابعہ کا نام منظر عام پر آئے۔ اس سے بہتر میرے

لے چھانی ہوگی۔“

”کیوں؟ کیا تمہیں پہلے ہی سے یہ ساری انکیم معلوم تھی۔“

”نہیں..... بلکہ میں بعد میں ان نتائج پر پہنچا ہوں۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں واپس آنے کے بعد تمہیں اس بات کا احساس ہوا کہ

تمہیں کسی خاص مقصد کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔“

”نہیں..... نہیں..... میں اس کے حلق کچھ نہیں سوچتا چاہتا۔ کچھ نہیں سمجھتا چاہتا۔ مجھے

اس کا اعتراف ہے کہ میں نے پروفیسر سے پھٹی نہیں لی تھی۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ رات کو

واپس نہیں آ سکتے۔“

”تو نشانہ مگر جانے سے پہلے تمہیں اس کی اطلاع نہیں تھی کہ تم نشانہ مگر جاؤ گے۔“

”مسٹر انور آپ یہ سب مت پوچھئے۔ کسی طرح یہ ثابت کر کے مجھے چھانی کے متھے تک

پہنچا دیجئے کہ میں ہی پروفیسر کا قاتل ہوں۔“

”کیوں؟ تم زندگی سے ہزار کیوں ہو گئے ہو؟“

”میں یہ سوچنے سے پہلے مر جانا چاہتا ہوں کہ جس پر مجھے PDA تھا اس نے مجھے فریب دیا۔“

”تمہارا اشارہ رابعہ کی طرف ہے۔“

سکریٹری نے خاموش ہو کر گردن جھکا لی اور انور سوچنے لگا کہ اسے اداکاری کبھی یا حقیقت کیا وہ کچھ راست بازی سے کام لے رہا تھا یا رابہ کو پھنسا کر خود الگ ہو جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم نے آخر پتھر کی چوڑی اور بازیافت کے حلق پولیس کو کیوں نہیں بتایا۔“
 ”مسٹر انور وہ پروفیسر کی زندگی ہی میں چرایا گیا تھا؟ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ کتنا بیش قیمت ہو سکتا ہے۔ پھر یہ بتائیے کہ خود پروفیسر ہی نے اس کی اطلاع پولیس کو کیوں نہیں دی۔“

انور چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا
 ”ظاہر ہے کہ وہ اس کی اطلاع پولیس کو نہیں دیتا پوچھتے تھے۔“ سکریٹری پھر بولا۔
 ”لیکن وہ پتھر اسے ملا کہاں سے تھا۔“ انور نے پوچھا۔
 ”مجھے اس کی اطلاع نہیں اور نہ میں یہی بتا سکتا ہوں کہ وہ ان کے پاس کب سے تھا۔“
 ”دھت میں رابہ بھی شریک تھی۔“
 ”ہاں..... وہ بھی تھی۔“ سکریٹری نے حوصلہ آواز میں کہا۔
 ”اور دوسری صبح کو کھراج شوکیں میں نہیں تھا۔“ انور نے کہا۔
 ”ہاں۔۔۔۔۔۔“

”اُسے رات ہی کو چور دی میں کیوں نہیں رکھ دیا گیا تھا؟“
 ”اب اس کے حلق میں کیا بتا سکتا ہوں۔ میں نے پروفیسر سے کہا بھی تھا لیکن انہوں نے کہا کہ نہیں اُسے شوکیں ہی میں رہنے دیا جائے۔“
 ”رابہ کس وقت تک تمہارے ساتھ رہا مگر میں رہی۔“
 ”تمہیں بچے تک..... بلکہ وہ وہیں رہ گئی اور میں واپس چلا آیا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں پروفیسر صبح ہی صبح واپس نہ آ جائے۔“
 ”تم اسے بہت چاہتے ہو۔“
 ”سکریٹری خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھیں جبک مٹی تھیں۔“

”نٹا نگر میں تم کہاں رہے۔“ اور نے پوچھا۔

”درحقیقت میری ایک خال نٹا نگر میں رات ہی ہے لیکن میں نے وہاں رات نہیں گزار دی تھی۔“

”مہر.....“

”راہبہ نے مہر.....“

”لیا نٹا نگر میں اس کا کوئی نمہ ہے۔“

”جی ہاں..... اکثر وہ لوگ تبدیل آب و ہوا کے لئے وہاں جاتے ہیں۔ ویسے وہ عموماً

خالی ہی رہتا ہے۔“

”کیا اس سے پہلے بھی تم لوگ اس قسم کی راتیں گزار چکے ہو۔“ اور نے پوچھا۔

”کبھی نہیں اور مجھے اس پر حیرت ہے کہ راہبہ بھی ڈر چوک لڑکی اس پر کیسے تیار ہو گئی تھی۔“

”تو کیا خود تم ہی نے اس سے اس کے لئے کہا تھا۔“

”قطعی نہیں..... یہ جو بڑا سی نے پیش کی تھی کہ ہم نٹا نگر میں رات گزاریں۔ حالانکہ اس

سے قبل وہ کبھی میرے ساتھ سینما تک نہیں گئی تھی۔ ایسی باتوں پر عموماً خوف ظاہر کیا کرتی تھی۔“

”لیکن نٹا نگر کیوں اتنی آزادی سے ملی گئی۔“

”اس نے کہا تھا کہ سر منیر رات کو گھر پر نہیں رہیں گے۔“

”اوہ.....!“ اور اُسے مستی خیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ ”یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہ اور

پروفیسر دونوں ایک وقت رات کو گھر سے باہر رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔“

”تو کیا..... تو کیا.....!“

”نہیں.....!“ اور ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”کسی قسم کا خیال ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا

قطعی یہ مقصد نہیں ہے کہ سر منیر نے تمہارے ذریعہ پروفیسر کو قتل کرا دیا۔ ہو سکتا ہے کہ جنہیں واقعی

اس کا علم نہ ہو۔ میں سر منیر کی طرف سے بہت زیادہ مشکوک ہوں اور پولیس کو کبھی اسی راستے پر

لگانے کی کوشش کروں گا۔“

”نہیں مسٹر انور..... نہیں خدا کے لئے..... اس طرح راہبہ کی بھی بنیادی ہوگی اور میں

اسے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا۔ میں پولیس کے سامنے اعتراف جرم کئے لیتا ہوں اگر آپ

نے اس قسم کا کوئی قدم اٹھایا تو میں خود کو قانون کے حوالے کر دوں گا اور میرا خون ناحق آپ کی گردن پر ہوگا۔“

”واہ رے میرے شیر.....!“ انور غصے سے کہنے لگا۔ ”تم نے تو فرہادی بھی قبر پر لات ماری۔“

نیویں مدی میں میں نے ایسا مشق نہیں سنا۔“

”مسٹر انور آپ جانتے ہیں۔“ سیکریٹری اسے گھورتا ہوا بولا۔

”ظاہر ہے کہ میں یہاں رات نہیں بسر کروں گا۔“ انور مسکرا کر بولا۔

”مجھے آپ سے ہمدردی کی توقع ہے۔“

”ہمدردی کی توقع اسی وقت رکھ سکتے ہو جب سب کچھ صحیح بنے۔“

”اور کیا میں ابھی تک جھک رہا تھا۔“ سیکریٹری نے بکڑ کر کہا۔

”میں تو یہی سمجھتا ہوں۔“

”مسٹر انور.....!“

”گرم ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ اٹھتا ہوا بولا۔ ”بعض اوقات میں لگاں کہ معلوم ضرور

دلا دیتا ہوں۔“

سونا گھاٹ سے واپسی پر انور کے ذہن میں عجیب قسم کا انتشار برپا تھا اور اس انتشار میں

کئی تصویریں ایک دوسرے سے ٹکرائی تھیں۔ راجہ، گھوڑا، گولس، سیکریٹری سر مسٹر احمد۔ وہ اٹھتا

رہا اور پھر شہر پہنچ کر اس نے اپنی موٹر سائیکل سر مسٹر احمد کی گولی کی طرف موڑ دی۔ گولی کے قریب

آئے سر مسٹر دکھائی دیا جو اپنی کار پر کہیں جا رہا تھا۔ انور نے موٹر سائیکل کی رفتار دہشی کر دی اور

جب اسے یقین ہو گیا کہ مسٹر کی کار کافی دور نکل گئی ہوگی تو اس نے اپنی موٹر سائیکل گولی کے

چھانک پر کمزری کر دی اور خود اندر چلا گیا۔

”کس سے ملتا ہے آپ کو.....!“ ایک نوکر نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”صاحب ابھی ابھی باہر

آئے ہیں۔“

”مس راجہ.....!“ انور نے اپنا لاکھٹی کارڈ نوکر کو دے دیے ہوئے کہا۔

نوکر چلا گیا اور انور برآمدے میں انتظار کرنے لگا۔ ٹھوڑی دیر بعد نوکر واپس آیا۔

”میں صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“
 ”اکن سے کہہ دو بہت ضروری کام ہے۔“ اور نے کہا اور پھر بلند آواز میں بولا۔ ”وہ کبجیاں۔“
 ”سسر انور۔۔۔!“ دروازے سے آواز آئی۔ ”اندر آجائیے۔“
 رابعہ سامنے کھڑی تھی۔ وہ خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔
 انور اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔
 ”کبجیاں واپس کر دیجئے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔
 ”کیسی کبجیاں؟“

”میں آپ سے اچھا کرتی ہوں۔“ وہ روئی آواز میں بولی۔ ”آپ جتنا رویہ طلب کریں
 گے میں آپ کو دے سکتی ہوں۔“
 ”بھلا ایک ایسے آدمی کو روپیوں پیسوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جو چھانی پر چڑھنے چلا ہو۔“
 ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“
 ”پولیس کو دہاں میری موجودگی کا علم ہو گیا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب پروفیسر کے قتل کا
 الزام بھی میرے ہی سر قحوب دیا جائے گا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ میرے خدا میں کیا کروں۔“ رابعہ سر ہٹ کر ایک منوٹے پر بیٹھ گئی۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ میری چھانی کی خبر اخبارات میں پڑھ لیجئے گا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔

”تو پھر یہ بتائیے کہ پروفیسر کا قاتل کون ہے۔“

”میں۔۔۔۔۔ میں کیا جانوں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔“

”کیا سر مفیر کو آپ کے اور پروفیسر کے سیکرٹری کی دوستی کے متعلق معلوم ہے۔“

”جی۔۔۔۔۔!“ وہ اچھل کر بولی۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ کیا انہیں یہ معلوم تھا کہ آپ سیکرٹری کے ساتھ تھلا گھر میں رات

بسر کریں گی۔“

”آپ بھوٹ بول رہے ہیں۔ میں سیکرٹری کو نہیں جانتی۔“

”تو پھر آپ نے اس کی کار چرائی ہوگی کیونکہ آپ اسی کی کار پر مجھ سے ملے گئی تھیں۔“
 ”جی.....“ رابعہ کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھل گئیں۔

”جی ہاں..... میرے لئے کوئی چیز ناممکن نہیں ہے اور کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ وہ بے
 کمار کو آپ کب سے جانتی ہیں۔“
 ”میں کچھ نہیں جانتی۔“ وہ بے اختیار رو پڑی۔ ”خدا کے لئے سچیاں واپس کر دیجئے اور اپنا
 حق اٹھ بتائیے۔“

”کیا اب میں حق اٹھ اپنی قبر میں لے جاؤں گا۔“

”پھر میں کیا کروں۔“

”سب کچھ کچھ بتا دیجئے۔“

”میں اس شخص کا نام نہیں بتاؤں گی۔“

”کیا قاتل کا۔؟“

”نہیں نہیں..... اس کا جس نے مجھے حکمران واپس کرنے کے لئے دیا تھا۔ لیکن وہ قاتل
 نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔“

”اچھا تو پھر میں ہی قاتل ہوں..... چڑھ جاؤں گا پھانسی پر۔“

”نہیں..... نہیں۔“ وہ بے تابانہ اٹھتی ہوئی بولی۔

”آپ کی یہ پریشانی مجھے پھانسی سے نہیں بچا سکتی۔“

”میں کیا کروں.....!“ وہ پھر بیٹھ گئی۔

”سکریٹری کچھ اس سازش میں شریک تھا یا آپ نے اُسے دھوکا دیا تھا۔“

”نہیں..... نہیں میں کچھ نہیں جانتی۔“

”آپ بہت کچھ جانتی ہیں۔“

”وہ پھر رو پڑی۔“

”دیکھئے یہ سب بیکار ہے۔ آپ کے آنسو بھی مجھے پھانسی سے نہیں بچا سکتے۔“

”مسٹر انور..... خدا کے لئے۔“

”میں مجبور ہوں۔“

”میں جانتی ہوں کہ آپ کا ہال بھی بیک نہیں ہو سکتا۔“

”یہ آپ کا خیال ہے۔“

”آپ بتائیے کہ میں آپ کو کتنا روپیہ دوں؟“

”روپیہ میں آپ سے نہیں لوں گا۔“

”پھر.....؟“

”میں نہیں تا سکتا۔ لیجئے یہ سچیاں منبیا لے۔“ اور سچیاں اس کی کود میں پیک کر کرکڑا

ہو گیا اور پھر جانے کے لئے مڑا۔

”مسز انور.....؟“

”فرمائیے۔“

”خدا کے لئے..... سنے تو..... ایک منٹ ٹھہر جائیے..... صرف ایک منٹ سنے تو۔“

وہ پکارتی عیار ہو گئی۔ انور کے قدموں کی آغوشیں دور ہوتی جا رہی تھیں۔

”مے پہل ہوئی میں ایک مسافر وچے کنار۔“ آصف نے کہا۔ اور نے بہت جلد سے کام لیا تھا۔ اگر وہ اس وقت بہت زیادہ محنت نہ کرتا تو جینا اچھل پڑتا۔

”اچھا.....“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”وہ مدرس کا ایک مشہور بد معاش تھا اور کئی بار کاسزایافتہ بھی۔“

”مدرس کا۔۔۔۔۔۔“ انور نے کہا۔ ”یعنی تو نہیں جو کسی جوہری کے یہاں ڈاکٹر والے کے
 سلسلے میں ناخوہ ہوا تھا۔“

”وہی..... وہی..... لیکن میں تمہاری یادداشت کی داد دیتا ہوں۔“

”تو وہ کن حالات میں قتل ہوا.....؟“

”ہوٹل والوں کا بیان ہے کہ شام کو جب وہ نئے میں نری طرح دھت خاک ایک آدمی اسے ہوٹل تک پہنچانے کے لئے آیا تھا۔ پھر دھڑوں نے اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔ تقریباً آٹھ بجے ایک دھڑ اس کا کہنا ہے کہ اس کے کمرے میں گیا اور وہاں سے اٹھے اور وہیں آیا۔ اس نے وہاں اس کی لاش دیکھی تھی ایک سجر اس کے سچے میں بکھرتا تھا۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ اسے نئے ہی کی حالت میں قتل کیا گیا تھا۔“

”اس آدمی کا یہ لگا جو اسے ہوش تک پہنچانے آیا تھا.....؟“ انور نے پوچھا۔

”پہ نہ گئے تو اچھا تھا.....!“ آصف بولا۔

“خیر”

اس سے کوئی قائدہ نہیں ہوا.....“

”یعنی“

”سر صغیر احمد نے اسے ہوٹل پہنچایا تھا۔“

”اوہ..... تو کیا وہ سرِ صغیر کا دوست تھا۔“ انور نے پوچھا۔

”نہیں..... وہ اسے ایک جگہ نشے میں پڑا ہوا ملا تھا۔“

”لیکن سر صغیر کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ بے پول ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔“

”انہوں نے اس سے پہلے بھی اسے ہوٹل میں دیکھا تھا اس لئے وہ اسے ہوٹل لے آئے

کہ شاید اسے کوئی بچھڑاتا ہو۔ وہاں پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ وہ وہیں ٹھہرا ہوا ہے۔
”اور تم نے اس پر یقین کر لیا۔“

”کیوں یقین کیوں نہ کرتا۔“ آصف بھٹا کر بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ انور نے کہا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی۔

گھر پہنچ کر اسے رشیدہ کو سارے واقعات کی مکمل رپورٹ دینی پڑی۔

”اب آ رہے ہیں دانتوں پیسے۔“ رشیدہ مسکرا کر بولی۔ ”پہلے ہی بیچ کیا تھا۔“

”تو کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں مت ہار گیا۔“

”نہیں تم ٹھہرے تیس اور تیس ساٹھ مارا تھا۔“

”بہت۔“ فضول بکواس نہیں۔ سونکل جھمیں قدیر کے دفتر میں جا کر پوسٹ مارم کے

پچھلے دو تین سال کے ٹھہرے دیکھتے ہیں۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ کبھی وہ پروفیسر جنوری اور سر منیر

اسو کے پیچھے پڑ گیا تھا ممکن ہے کہ کوئی کام کی بات ہاتھ لگ جائے۔“

”فضول اور بے کار۔“ رشیدہ اٹکا کر بولی۔ ”تم ہمیشہ مکی باتیں سوچتے ہو۔ خواہ تو اور

سری مول لینے سے کیا فائدہ۔“

”بہتر ہے میں یہ کام خود ہی انجام دے لوں گا۔“ انور بگڑ کر بولا۔ ”تم سمجھتی ہو کہ تمہارے

غیر میں لپاچ ہو جاؤں گا۔“

”اچھا بابا اچھا بھڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں ضرور جنگ ماروں گی۔“

انور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

”ہیلو۔۔۔“ انور نے ریشیور اٹھالیا۔

”اوہ انور!۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”میں ہوں قدیر۔ میں نے فیصلہ کیا ہے

کہ میں اب کچھ بتاؤں۔ یہ معاملہ سنگین ہے ممکن ہے کسی قانونی ٹکچے میں جھنسن جاؤں۔“

”تم مجھے کیا بتاؤ گے۔“ انور نے پوچھا۔

”مکی کہ پروفیسر کا سکریٹری کل رات کو کہاں اور کس کے ساتھ تھا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ انور مسکرایا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکلنے لگا۔

”تم کچھ نہیں جانتے۔“ دوسری طرف سے قہقہہ کی آواز آئی۔

”میں پوچھتا ہوں کہ تم کس طرح ان کے پیچھے لگ گئے تھے۔“

دوسری طرف سے پھر قہقہہ سنائی دیا۔ ”دیکھو انور تم میرے احسان سے کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ اس قسم کی مشکوک کرنے کے بعد انور مجھ سے معلومات حاصل کر کے تم کو ہدایت کرے گا۔“

”یہ بات نہیں بیدار۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”میں راہبہ اور نیکو شہری کے عشق کے حلقے ایک شادی لکھ رہا ہوں اور اس کے جملہ حقوق تمہارے نام محفوظ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“

”اوہ تو تمہیں بچ بچ معلوم ہے۔“ قدرتی جھنجھکی ہوئی فہمی کے ساتھ بولا۔

”لیکن یہ بتاؤ کہ تم نے ان کا تعاقب کیوں کیا تھا۔“

”اب اسے پوچھ کر کیا کرو گے؟ اسی کی روٹیاں کھاتا ہوں۔ اگر پروفیسر کا قتل نہ ہو جاتا تو البتہ ایک متوطن رقم ہاتھ آنے کی امید تھی۔ سر مشیر کسی نہ چاہتا کہ اس کی لڑکی بدنام ہو جائے۔“

”سر مشیر۔“ انور طعنے انداز میں بولا۔ ”اسے شاید یہ نہیں معلوم کہ وقت اس کے لئے پانی کا پھندا تیار کر رہا ہے۔“

”کیوں۔۔۔ کیا۔۔۔ وہ۔۔۔ یعنی وہ۔۔۔“

”ہاں مجھے اس پر شبہ ہے اور بہت جلد پولیس بھی میرے ہی راستے پر آ جائے گی۔“

”نہیں یعنی۔۔۔ تم آخر اس پر کیوں شبہ کر رہے ہو۔ اگر کوئی ہی ہوا تو؟“

”لیکن اسے اپنے ہی شک و شبہ دور رکھنا کہ میں اس پر شبہ کر رہا ہوں۔“

”اے یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”ممکن ہے کل میں رشیدہ کو کسی کام سے تمہارے پاس بھیجوں۔“

”نمرود۔۔۔ نمرود۔۔۔ بڑی خوشی ہے۔“

”اچھا شب بخیر۔“ انور نے ریشور رکھ دیا اور رشیدہ کی طرف حذر کر کے گھٹنے ٹیکنے لگا۔

”وہ کب اور وہی تھا۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

”کلن۔“

”جس نے مرداسی جوہری کے یہاں ڈاکر ڈالا تھا اور انتہائی کوششوں کے باوجود بھی سیاہ بکراج اس کے پاس سے برآمد نہیں ہوا تھا۔“

”سیاہ بکراج.....؟“ رشیدہ حمیرہ کو بولی۔ ”آخر تمہارے سر پر سیاہ بکراج کیوں سوار ہے۔“
انور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کوٹ اتارنے ہی چاہ رہا تھا کہ رشیدہ پھر بولی۔
”کیا کھانا کھانے کا ارادہ نہیں۔“

”نہیں.....؟“ انور نے کہا اور پیڑے اتارنے لگا۔ ”میں نے تم سے سوچا کہ دیا کہ کھانے کے لئے میرا انتظار کیا کرو۔“
”بہتر ہے۔“ رشیدہ جھلا کر بولی اور کمرے سے چلی گئی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح میرا سیکڑو آصف سے ملے بیٹھ ہو گئی۔ انور کا ارادہ تھا کہ وہ سب سے پہلے اپنے ایشیا کیلئے جاسوسی ناول کی قسط لکھے گا پھر کسی دوسرے کام میں ہاتھ لگائے گا۔ لیکن سوکر اٹھنے کے بعد اسے آصف کا منہ دیکھنا پڑا۔ جو غلاف معمول بہت زیادہ بارش میں مغموم ہو رہا تھا۔
”دیکھا تم نے.....؟“ وہ چمک کر بولا۔ ”اس بار تم پھنسٹی ہو گئے۔“

”کیوں.....؟“

”عالم پکڑ لیا گیا۔“

”یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ جھگڑا قتل ہی پر ختم ہوتا۔“ انور نے کہا اور آصف ہنسنے لگا۔
 ”خیر..... کیا یہ جوت بھی ناکافی ہے کہ وہ اتھوڑا جس سے پروڈیوسر قتل کیا گیا کولس ہی کا تھا۔“
 ”یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا۔“
 ”کولس کے ایک دوست ریٹائرڈ حوالدار میجر شمشیر سنگھ نے اسے شہادت کیا ہے۔“
 ”اوہ..... وہ بگلا حوالدار میجر.....؟“ انور قہقہہ لگا کر بولا۔ ”یقیناً اپنی عقل کے بجائے تم
 خود کہیں جرنے گئے تھے۔“

”کیوں.....؟“
 ”بھلا اس پاگل کی شہادت کس عدالت میں پیش کرو گے۔“
 آصف نے پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور انور اسے مکور نے لگا۔
 ”خیر..... خیر..... تم بہت زیادہ عقل مند نہیں ہو۔ خود کولس نے اس بات کا اعتراف کیا
 ہے کہ وہ اتھوڑا اسی کا ہے۔“ آصف مسکرا کر بولا۔
 ”کولس نے.....؟“

”ہاں ہاں کولس نے اور اس سے یہ بھی انکوا لیا جائے گا کہ وہ پروڈیوسر کا قاتل ہے۔“
 ”اچھا تو کیا اسے اس سے انکار ہے۔“
 ”ہاں..... وہ اس کا اعتراف تو کرتا ہے کہ اتھوڑا اسی کا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ وہ
 پروڈیوسر کے گھر میں پہنچا کیسے۔“
 اس بار انور نے ایک جوت ڈکائی قہقہہ لگایا اور آصف کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔
 ”آصف میان تم ابھی بڑھے ہو۔ اگر وہ بچ پروڈیوسر کا قاتل ہوتا تو کبھی اس بات کا
 اعتراف نہ کرتا کہ وہ اسی کا اتھوڑا ہے۔“
 ”مگر حوالدار میجر.....؟“

”وہ مجبوراً الحواس ہے۔ اس لئے اس کی شہادت قانون کی نگاہ میں بے مصرف ہے۔“
 ”خیر میں تمہیں دکھا دوں گا۔“ آصف جھلا کر بولا۔
 ”مگر مفت دکھانا کیونکہ میں تمہارا بہت پرانا دوست ہوں۔“

آصف نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بدستور انور کو گھورے جا رہا تھا۔
 ”خیر ہٹاؤ.....“ انور تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”پروفیسر کے کسی وارث کا پتہ چلا۔“
 ”ہاں اس کا ایک بھائی سرحدی علاقے میں سمور کی تجارت کرتا ہے۔ پروفیسر کے قانونی مشیر نے اسے اطلاع دی تھی۔ اس پر اس نے اسے بذریعہ تار ہدایت کی کہ پروفیسر کا سارا اثاثہ بچ ڈالا جائے اور دوسری دلچسپ بات یہ کہ ایک آدمی پروفیسر کی خواب گاہ کا سارا سامان خریدنے پر مجبور ہو گیا ہے۔“

”صرف خواب گاہ کا سامان؟“ انور چونک کر بولا۔ ”وہ آدمی کون ہے؟“
 ”اس نے مسٹر داس سے فون پر بات چیت کی تھی۔ غالباً وہ کسی بینک کے ذریعہ یہ سوا طے کرے گا۔“

”اس نے اپنا نام بتایا ہی ہوگا۔“ انور نے کہا۔
 ”ہاں..... بے پی سنگھ.....“
 ”لیکن کس بینک کے ذریعہ۔“
 ”ابھی یہ کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔“

انور نے نوٹ بک اٹھا کر اس میں آصف کا بتایا ہوا نام لکھ لیا۔ اسکے ذہن میں جموری ناچ رہی تھی جس میں سیاہ بکمران رکھا جاتا تھا اور وہ جموری پروفیسر کی خواب گاہ میں رکھی ہوئی تھی۔
 ”یہ بتاؤ کہ وہ صرف خواب گاہ ہی کا سامان کیوں خریدنا چاہتا ہے۔“ انور نے پوچھا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔“ آصف نے کہا۔
 ”کیا وہ جموری خواب گاہ میں ہی نہیں ہے جس میں وہ سیاہ بکمران رکھا ہوا ہے۔“
 ”اگر یہی بات ہے تو اس احمق خریدار کو بعد میں بڑی مایوسی ہوگی۔“ آصف افس کر بولا۔
 ”کیوں؟“

”بیکری نے اس تھڑ کو بینک میں رکھوا دیا ہے۔“
 ”اچھا اس بینک میں؟“
 ”بیشل بینک.....“

”اوہ.....!“ اور اچھل کر بولا۔ ”اور سرِ صفر اس بنک کا 13 بیگن ہے۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ سرِ صفر ہی پروفیسر کا قاتل ہے۔“

”یقیناً تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ آصف منہ بنا کر بولا۔

”خیر دیکھا جائے گا۔“

”آخر تم سرِ صفر کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔“ آصف نے کچھ سوچے ہوئے کہا۔ ”اور میں

یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ تم کسی سیاہ چتر کا تذکرہ بار بار کرتے رہے ہو۔“

”صرف یہی نہیں۔“ اور مسکرا کر بولا۔ ”میں یہ بھی ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ وجے کمار کا

قتل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔“

”شاباش.....!“ آصف نے قہقہہ لگایا۔ ”بس اب صرف انہوں کی ایک گولی اور پاؤ

بھر دودھ کی اور ضرورت پڑے گی۔ اس کے بعد تم اپنے استاد کے بھی کان کاٹ لو گے۔“

اور نے کوئی جواب دینے کے بجائے تالیف کاغذ پر ڈالا اور قتل خانے کی طرف چلا

گیا۔ آصف تھوڑی دیر تک بیٹھا کچھ سوچتا رہا پھر وہ بھی اٹھ کر چلا گیا۔

ناشہ کرتے وقت انور رشیدہ سے کہہ رہا تھا۔

”آج تم آفس نہیں جاؤ گی تمہیں روزنامہ ”پوسٹ مارٹم“ کے پرانے قاتل اٹھتے ہیں اور

ہاں ایک اور نئی دریافت..... تم یہاں کے سارے بینکوں میں محکمہ پھر کر یہ پتہ لگاؤ کہ کسی نے

جے بی سنگھ کے نام سے اس دوران میں کوئی رقم تو نہیں جمع کرائی اور جمع کروائی ہے تو کس

نے۔“

”قاتل تو میں دیکھ لوں گی مگر یہ دوسرا کام میرے بس کا نہیں۔ کہاں کہاں کی خاک چھاتی

پھر لوں گی۔“

”قدر کو ساتھ لے لیتا۔ میں اس سے فون پر کہہ دوں گا۔“

”بھئی..... یہ قدر.....!“ رشیدہ منہ بنا کر بولی۔ ”بہت بڑا ہے..... خواہ تو وہ بھیجا چاٹ

ڈال ہے۔“

”بہر حال آج تو تمہیں اسے پروا نہت کرنا ہی پڑے گا۔“
 ”لیکن یہ جے بی کنگ کون ہے اور کہاں سے ٹپک پڑا“ رشیدہ نے پوچھا اور انور نے پورا

واقعہ ہر ادا کیا۔
 ”جب کولس نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ تھوڑا سی کام ہے تو پھر اب خواہ تو اب بھاگ دوڑ کی کیا ضرورت ہے۔“ رشیدہ بولی۔

”یہ ایک اچھا خاصا معرکہ ہے۔“ انور سگریٹ سلکاتا ہوا بولا۔ ”اور اب گھبراہٹ کو بھٹکا ہی پڑے گا۔ وہ کوئی اہم بات جانتی ہے جسے چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کولس پروفیسر کا قاتل نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ کبھی اسے اپنا تھوڑا سا تسلیم کرنا۔“

جنگ اور خاتمہ

دوسری صبح انور کو صبح سویرے کوار معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی پچھلی تازگی دوبارہ لوٹ آئی تھی اور اس کے چہرے پر کنگ کے بادل نہیں تھے۔ پچھلی رات کو رشیدہ اس کا انتظار کرتے کرتے سو گئی تھی اور وہ تقریباً دو بجے رات کو چہرہ کی طرح اپنے کمرے میں داخل ہو کر چپ چاپ سو گیا تھا۔ صبح چھ بجے آٹھ گھنٹہ گئے جانے کے باوجود بھی وہ ابھی تک بستر میں پڑا انتظار کیاں لے رہا تھا۔ ذہن اور جسم دونوں تھکے ہوئے معلوم ہو رہے تھے اس کے باوجود بھی وہ صبح اس کے لئے حد تو گھٹا رہی۔

”جیسے آصف.....“ وہ خود بخود بیزبیاں لیا۔ ”اس بار تمہیں مرنا پڑے گا کہ چھوڑ دوں گا۔“
 تھوڑی دیر بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ انور نے بڑا سامانہ بنایا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔
 رشیدہ طوفان کی طرح اندر داخل ہوئی اور پھر دوسرے ہی لمحے میں چونک کر انور کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر کچھ اور قریب آ کر اس طرح نچنے سکڑے جیسے کچھ سو گھنے کی کوشش کر رہی ہو۔
 ”اوہ.....“ انور بھی اسی انداز میں بولا۔

”تم تو کبھی کوئی خوشیوں میں استعمال کرتے تھے۔“ رشیدہ منہ سکڑ کر بولی۔

[illegible]

”مجھے اس سے انکار کب ہے۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”نہ جانے کیوں وہ اس وقت لڑنا نہیں

چاہتا تھا۔“

”دیکھو تمہیں بتانا پڑے گا۔“

”چھ تو سنو! کل رات میں گھوڑا سے ملاتھا اور اسے سیدھی راہ پر لانے کے لئے مجھے اسے شراب بھی پانی پڑی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد نشے میں مجھ پر آ گری۔“

رشیدہ کچھ سوچنے لگی لیکن انور پھر بولا۔

”اب تمہارا دماغ صاف ہوا یا نہیں۔“

”گھوڑا سے تمہیں کیا معلوم ہوا۔“ رشیدہ نے پوچھا۔

”میں نے اسے راز رکھنے کی قسم کھائی ہے اس لئے مجبور نہ کرو لیکن اتفاقاً ضرور بتا سکتا ہوں

کہ یہ دونوں قتل اس پتھر کے سلسلے میں نہیں ہوئے۔“

”پھر۔۔۔“

”پہلے تم مجھے اپنے کل کے کاموں کی رپورٹ دو۔۔۔۔۔“

”وہ بے شمار کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ مگر ۱۹۵۰ کے قاتل میں مجھے ایک دلچسپ بات

نظر آئی تھی۔“

”وہ کیا۔۔۔۔۔“

”قدیر اس زمانے میں پروفیسر تیوری کے خلاف لکھ رہا تھا۔ تقریباً چودہ بیس شماروں میں

اس نے اس کے خلاف لکھا ہے اور پھر اچانک گھٹنا بند کر دیا اور پھر ایسی صورت میں جبکہ ایک دن

قبل اس نے یہ لکھا تھا کہ وہ دوسرے شمارے میں کچھ اور دلچسپ باتیں لکھنے کی کوشش کرے گا

لیکن اس نے دوسرے شمارے میں پروفیسر کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ بلکہ جب سے اب تک اس کا

نام تک نہیں لیا اور اسی آخری شمارے میں ایک خبر بھی دیکھی جس میں یہ تھا کہ سونا گھاٹ پر

تیوری منزل کے قریب کسی نامعلوم آدمی کی موٹر کے نیچے ایک بڑھیا دب کر مر گئی۔ مجرم کی تلاش

جاری ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”بہت اچھے۔۔۔۔۔“ انور جھج کر بولا۔ ”مسلحہ کس تاریخ کا شمارہ تھا۔“

”۱۳ جون ۵۰ء کا۔“

”بہر بہت اچھے..... رشوت نے کمال کر دیا۔“ انور نے اسے جھوڑ کر کہا اور رشیدہ حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی، وہ چھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”اچھا بک کا کیا رہا۔“

”سارے بک دیکھ ڈالے لیکن کچھ پتہ نہیں چلا۔“ رشیدہ نے کہا۔ ”قدریہ دن بھر میرے ساتھ مارا مارا پھرا اور اچانک اس کے پیٹے میں بڑا شہیہ دردا تھا جس کی بناء پر میں نے اسے واپس کر دیا۔ اس نے کہا کہ اس قسم کی تلاشی بے سود ہے۔“

”کوئی بک چھوٹا تو نہیں۔“

”چنانچہ بک..... میرا خیال ہے کہ وہی باقی بچا تھا۔ قدریہ نے کہا کہ وہاں جانا فضول ہے کیونکہ وہاں پر زیادہ تر غیر ملکی سرمایہ رہتا ہے لیکن میں اسے واپس کرنے کے بعد وہاں بھی مکی تھی اور اب تم اچھل پڑو کیونکہ وہاں بے بی نگہ کے نام پانچ ہزار روپے نفل کھائے گئے ہیں۔“

”کس نے نفل کیا ہے۔“ انور نے بے تابی سے پوچھا۔

”مسٹر قدریہ احمد ایئر ٹر روزنامہ پوسٹ مارٹم.....!۔“

”وہ مارا.....!۔“ انور اچھل کر بولا۔ ”بتایا آصف کو مرنے کا۔“

”لیکن یہ معاملہ کیا ہے۔“

”بہت بڑا معاملہ رشو۔ یہ تو ایک دلچسپ اتفاق ہے۔ ورنہ میں بدھو بن گیا تھا۔“ انور نے کہا اور فون کی طرف لپکا۔

”ہیلو.....!۔“ وہ ریسپور کان کے قریب لے جا کر رشیدہ کو آگے مار کر بولا۔ ”ہیلو..... کیا

قدریہ صاحب ہیں..... اوہ..... اچھا۔“ وہ ریسپورر کہ کر رشیدہ کی طرف مڑا۔

”میں نے قدریہ کے آفس میں فون کیا تھا۔ وہ گھر پر موجود ہے جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم لوگ وہیں چائے پئیں گے۔“

”آخر بات کیا ہے؟“

”جاؤ جلدی جاؤ۔“ وہ اُسے دروازے کی طرف دھکیلا ہوا بولا۔ ”بات پھر بتاؤں گا۔“

رشیدہ چلی گئی اور انور دوسرے کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کرنا لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے بیڑی کے دروازے ایک ہتھول نکالا اور اسے چھانچے دیکھتے رہنے کے بعد پھر دروازہ میں بند کر دیا اور اب ایک چمکدار چاقو اس کی ٹمٹی میں دبایا ہوا تھا۔ یہ سن کر اس نے بے لالہ مہر کے لئے تیار ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں میز سائیکل پر قدیم کے جنگل کی طرف جا رہے تھے راستے میں ایک ٹیلی فون پوسٹ کے قریب انور نے میز سائیکل روک کر دکاندار کی سیڑھی پر چڑھ کر کہا۔

”کیوں کیا بات ہے“ رشیدہ نے پوچھا۔
 ”میں صرف کو فون کروں گا۔“ انور نے کہا۔
 ”مگر میں نے کہا تھا کہ اس دکاندار سے تم کو کچھ کہنا ہے۔“ رشیدہ نے کہا۔
 ”خیال نہیں آیا تھا۔“ یہ ضروری ہے۔“ انور نے کہا۔
 فون کرنے کے بعد وہ پھر چل پڑے اور پتہ راستہ جلد ہی ملے ہو گیا۔ وہ پھر ٹیلی فون میں تھے کہ قدیم باہر نکلا۔ شاید وہ کہیں باہر جانے کے لئے تیار تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس لٹکا رکھا تھا۔

”ہیلو۔۔۔ انور۔۔۔ رشیدہ“ وہ انہیں دیکھ کر چکا۔ ”اگر کیسے بھول پڑے۔ آؤ ہمیں آؤ۔“
 اس نے اپنا جانا تھوڑی دیر بعد۔
 ”کہیں باہر جا رہے تھے۔“ انور سوٹ کیس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”اس میں کچھ کاغذات ہیں۔ آؤ آؤ۔“ چلو اندر چلو۔“ انور نے کہا۔

”ہم کو کون نے ایسی چائے نہیں ملی۔“ میں وہاں تھادی خیریت پوچھنے کے لئے آیا تھا۔
 رشیدہ سے معلوم ہوا کہ کل تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ کسی کل کی تکلیف کا بہت بہت شکر ہے۔
 ”دوستوں کے لئے میں ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار رہتا ہوں۔“ قدیم مسکرا کر بولا۔ ”میں تمہاری طرح تو ہوں نہیں۔ نہ جانے کب سے تم سے کہہ رہا ہوں کہ ایک جاسوسی ناول میرے اخبار کے لئے بھی لکھ دو مگر تمہیں فرحت ہی نہیں ملتی۔“

”مجھے شرمندگی ہے۔“ انور افسوس ظاہر کرتا ہوا بولا۔ ”میں ضرور کھوں گا۔“

[illegible][illegible]

”وہ بہت افسوس مند تھا۔“ وہ مرنے چلا تا ہوا بولا۔ ”اس وقت مجھے ۳۳ سال ۵۵ کی حسین شام یاد آ رہا ہے۔“

قدیر نے چائے کی پیالی میں بڑھک دی اور شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ الوداع کی طرف دیکھے۔

۱۔ ان ہی اور بھی بہت بکھار دئے گئے۔ کہ ان کے پاس سے پورے قیام

تمہیں سمجھاتا ہوں کہ پرچہ میرے حوالے کر دو اور اس واقعے کو بھول جاؤ۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔۔۔۔۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے اسے کہاں رکھا ہے میں خود تلاش کر لوں گا۔ ورنہ دوسری صورت میں تم جانتے ہی ہو کہ ایک قتل کو چھپانے کے لئے اکثر کئی قتل کرنے پڑتے ہیں۔ وجہ کار کا قتل شاید تمہیں یاد ہو۔“

”مجھے سب کچھ یاد ہے۔“ انور بھاری سے بولا۔ ”لیکن یہ پرچہ وہ چھپایا ہے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”بچے انور تم مجھ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ کل رات کو جب تم پروفسر کی خواب گاہ کی تلاش لے رہے تھے میں بھی اس کے مکان میں کھنسنے کی کوشش کر رہا تھا اور جس نے بعد کو تمہارا تعاقب کیا تھا وہ میں ہی تھا۔ تم شاید مجھے پولیس کا سپاہی سمجھتے تھے اور اس کے علاوہ سمجھتے بھی تو کیا۔ میں باقاعدہ پولیس کی وردی میں تھا۔ شاید بتا دو جلدی سے کہ وہ پرچہ کہاں ہے۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔“

انور تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔
”اس پرچے کی قیمت دس ہزار روپے ہے۔“
”مختصر مختصر بدلائی نہیں ہوتی فرزند۔“ قدیر مسکرا کر بولا۔ ”تم مجھ سے دس پیسے بھی وصول نہیں کر سکتے۔ اگر تمہیں زرعی عزیز ہوگی تو آپ بتاؤ گے۔“

”لیکن شاید تمہیں یہ نہیں معلوم کہ میں انکپنڈ آف فون کر کے یہاں آیا ہوں۔“ انور بولا۔
”اس کی فکر مت کرو۔ میں اسے بچوں کی طرح بھلا سکتا ہوں۔“ قدیر نے کہا۔
”فی الحال میں جا رہا ہوں۔ اسے اچھی طرح سمجھ لو اور تم رشیدہ اسے سمجھانے کی کوشش کرو۔ مفت میں اپنی اور تمہاری جان گموائے گا۔“

قدیر چلا گیا۔
”آخر یہ سب کیا ہے۔“ رشیدہ خوف زدہ آواز میں بولی۔
”یہ ایک وقتی تفریح ہے۔“ انور ہنس کر بولا۔ ”مجھے قتل کرنے کے لئے قیامت کے قریب دجال کا ظہور ہوگا اس سے پہلے تو مرنا نہیں۔“

کی کھنگھلی میں لی تھی کہ وہ رات وہیں گزار دیں گے۔ اس نے سوچا کہ پروفیسر اس وقت بخیر ہوگا۔ اس لئے وہ خلاف توقع رات ہی کو تار جام سے واپس آ گیا تھا۔
 ”لیکن آخر اس نے پروفیسر کو قتل کیوں کیا۔“ رشیدہ بولی۔

”وہی بلیک میلنگ کا پتہ تھا۔ تم نے اس اخبار کے فائل تو دیکھے ہی ہیں تم یہ بھی جانتی ہو کہ وہ پروفیسر کے خلاف لکھ لکھ کر اس سے روپیہ اکٹھا چاہتا تھا۔ لیکن شاید پروفیسر نے اس کی پروا نہیں کی۔ تب وہ جون ۵۵ء کے شمارے میں قدرے بے اس کا کوئی راز افشاء کرنے کی دھمکی دی تھی۔ شاید اس پر پروفیسر نے اسے معاملات طے کرنے کے لئے سونا گھاٹ بلا دیا تھا۔ وہاں اتفاق سے ایک بڑھیا اس کی کار کے نیچے آ کر ہلاک ہو گئی۔ پروفیسر نے دیکھا اور اسے دھمکی دی کہ وہ پولیس کو اس کی اطلاع دے دے گا۔ قدر گیا تھا اس سے روپیہ اکٹھے اور خود مصیبت میں پھنس گیا۔ آخر کار ان دونوں میں سمجھوتہ ہو گیا۔ پروفیسر نے اس سے بڑھیا کو کار کے نیچے پھیل دینے کا اقرار نہ کھسکا اور اسے دھمکی دی کہ اگر وہ بھی اسے یا اس کے کسی دوست کو بلیک میل کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ اس اقرار نامے کو پولیس کے حوالے کر دے گا۔ اس نے اقرار نامہ نہایت اطمینان سے اپنی خواب گاہ کی ایک کرسی کے گودے میں ہی رکھا تھا۔ قدرے بے اس اقرار نامے کے لئے اسے قتل کیا تھا۔ ہو سکتا ہے بعد کو پروفیسر نے بھی اس سے روپیہ اکٹھے کی کوشش کی ہو۔ بہر حال وہ قتل کی رات کو اقرار نامہ نہ پانے کا لیکن شاید یہ جانتا تھا کہ وہ خواب گاہ میں کہیں محفوظ ہے۔ لہذا اس نے جی بی سنگھ کے فرضی نام سے خواب گاہ کا سامان خریدنے کی پیش کش کی اور پھر جب تم اس کے پاس اس لئے پہنچیں کہ وہ تمہیں جی بی سنگھ کا پتہ لگانے میں مدد دے تو وہ بھڑک گیا اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ تم اس کے اخبار کے فائل خواہ تو انہیں الٹ پلٹ رہی ہو۔ ہاں تو میں نے تجھے کر لیا تھا کہ رات کو پروفیسر کی خواب گاہ کی حفاظت ضروریوں کا اصرار ہے۔ جی بی سنگھ میں تھا۔ وہ ایک پولیس میں کی وردی پہنے ہوئے تھا جب میں وہ اقرار نامہ مکمل کر رہا تھا۔ اس نے میرا تعاقب کیا مگر میں اسے پہچان نہیں لیا تھا اور نہ اس وقت مجھ سے یہ شناخت نہ ہوئی تھی۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میں اس کے حلق میں کچھ نہ تھاسکوں گا۔ میں نے گوریلا سے وعدہ کر لیا ہے۔“

”گوریلا سے؟“

”ہاں..... اے بھول جاؤ۔“

”تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم لوگ کچا جائیں گے۔“

”کیوں نہیں..... جب تک کہ میری شریک نہ کٹ جائے میں بھی سوچتا ہوں گا کہ میں مر نہیں سکتا۔ میں نے آصف کو فون کر دیا تھا کہ میں قدم کے یہاں جا رہا ہوں۔ قابل وہی ہے اے ہایت کروں گا۔“

”ممکن ہے وہ آکر لوٹ بھی گیا ہو۔ قدم نے اُسے پتلا پڑھا دی ہو خود اس کے پاس تو اس کا کوئی ثبوت ہے نہیں۔ تمہارے بیان کے مطابق اقرار نامہ تمہارے ہی پاس ہے۔“

”پھر بھی میں ہمت نہیں ہار سکتا“ انور نے کہا اور اپنے جوتے اتارنے لگا پھر اس نے ایک پیر کا موزہ دوسرے پیر سے دبا کر اتار دیا۔ ہاتھیں پیر سے دائیں پیر کی موری اوپر سرکائی اور موزے میں اڑا ہوا ایک بڑا سا پچھلدار چاقو نکال کر فرش پر ڈال دیا۔ رشید اُسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ انور نے دابھے پیر کا موزہ بھی اتار دیا۔

”لیکن اُسے استعمال کس طرح کرو گے..... دونوں ہاتھ تو بندھے ہوئے ہیں۔“ رشید پر امید لہجے میں بولی۔

”ڈارون کی تصدیق کے مطابق آدمی پہلے بندر تھا۔“ انور نے مسکرا کر کہا۔ ”مورقم جانتی ہی ہو۔ بندر پھروں سے بھی ہاتھوں کا کام لے سکتے ہیں۔ دنیا کے سب بندر آدمی ہو گئے مگر میں ابھی تک بندر ہوں اور اس وقت تمہیں اس کا بھی اعزاء ہو جائے گا کہ میں کسی حال میں بھی بھوکا نہیں رہ سکتا۔ کئی سرکس والے اب تک یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے سرکس میں تو کڑی کر لوں۔“

انور نے چاقو کا دستہ دابھے پیر کے انگوٹھے اور انگلیوں سے دھایا اور لوہے کی پتھروں کو مضبوطی سے پکڑ کر بندروں کی طرح الٹ گیا۔ وہ دابھے ہاتھ کی رسی کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کلائی پر رسی کا تھوڑا بڑھ جانے کی وجہ سے وہ زیادہ دیر تک اس حالت میں نہ رہ سکا۔ لیکن اسے

یقین تھا کہ وہ ری کاٹے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ ایک کراہ کے ساتھ پھر سیدھا ہو گیا۔
سارے جسم سے پسینے کی دھاریں بھوٹ پڑی تھیں اور وہ نئی طرح ہاتھ رہا تھا۔ اس نے سکرا
کر رشیدہ کی طرف دیکھا اور رشیدہ بے اختیار رو پڑی۔ وہ انور کی کلائی پر ہتھے ہوئے خون کو دیکھ
رہی تھی۔ شاید چاقو لگ گیا۔

”رشو ڈارنگ روتے نہیں۔“ انور نے کہا اور پھر چاقو کو اٹھیں میں دبا کر اٹ گیا۔ اس
کی چرتی ہوئی سانسوں کے ساتھ رشیدہ کی سسکیاں بھی کھری میں کوچ رہی تھیں۔
تھوڑی دیر کے بعد اس کا ایک ہاتھ آزاد ہو گیا اور رشیدہ روتے روتے بے اختیار ہنس پڑی۔
انور نے دوسرا ہاتھ بھی کھول ڈالا اور پھر رشیدہ بھی آزاد ہو گئی۔ وہ اس کے بازوؤں میں پڑی سسکیاں
لے رہی تھی۔

”رشو ڈارنگ، چپ رہو۔“ وہ اپنا ہوا بولا۔

”میرا بندہ..... میرا بندہ.....!“ اس نے دلی سسکیوں کے درمیان کہا۔
”آؤ اب کل چلیں..... مجھ میں کمرے ہونے کی سکت نہیں۔ یہ دیکھو۔“ اس نے اپنا
دایا ہاتھ سامنے کر دیا جس سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔ شاید کوئی رگ کٹ گئی تھی۔ وہ دونوں
دروازے کی طرف بڑھے لیکن وہ باہر سے بند تھا۔
”یہ تو بہت برا ہوا۔“ رشیدہ بولی۔

”فکرت کرو..... کبھی تو کھلے گا۔“ انور نے کہا اور دیوار سے ٹک لگا کر دروازے کے
قریب ہی بیٹھ گیا۔ رشیدہ اپنی ساری پناہ اس کے ڈنکی ہاتھ پر بیٹھ گئی۔
انور بڑی خاموش محسوس کر رہا تھا ایک تو ابھی تک اس نشہ آور چائے کا اثر باقی تھا دوسرے
ہاتھ سے کافی خون نکل گیا تھا اور پھر اس جتنا تک کی تحن..... دونوں تھکوں ہی طرح بیٹھ رہے۔
قریباً تین بجے کھری کے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ انور نے رشیدہ کو دروازے
کے دوسرے طرف کمرے ہو جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی کھڑا ہو گیا۔

کڑی اتارنے کی آواز آئی۔ دونوں پٹ کھل گئے۔ انور اور رشیدہ پٹوں کی آڑ میں تھے
جیسے ہی قدر اندر داخل ہوا انور اس پر ٹوٹ پڑا۔ رشیدہ الگ کھڑی تھی۔ انور نے اسے پہلے ہی

تعلے میں گر گیا تھا۔ مگر قدرتی بھی کہ وہ نہیں تھا۔ وہ اپنی ساری طاقت صرف کر رہا تھا۔ دونوں کھتے ہوئے زمین پر لڑتے رہے تھے۔ رشید کی سجدہ میں لیکن آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ دھنیا قدرتی اور کے لیے پڑا ہوا تھا۔ وہ اس کا کھانا کھاتے رہا تھا۔ رشید گھبرا گئی۔ دھنیا اسے وہ چاقو تیار کیا جو انور وہیں کنی ہوئی رسیوں میں چھوڑ آیا تھا۔ وہ چاقو اٹھا کر دیوار نہ دار قدرتی پر ٹوٹ پڑی۔ وار گھبرا نہیں تھا مگر بھی قدرتی چھیل کر پیچھے کی طرف آ کر اسے اس کے کہ وہ چھیل انور اس پر تھا۔

تموڑی دیر بعد انور اور رشید اسے رسیوں میں پھنسا دے تھے۔ اس کے بعد انور نے انور کے خلاف اس حیرت انگیز گرفتاری پر طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے لیکن کبھی واقعہ صرف انور کے اختیار نے چھاپا تھا انور اس کی گالیاں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی تھیں۔

وہ دن انیکڑ آصف کے لئے قیغہ بڑا بھول تھا۔ انور نے جی کھول کر اس کا منہ کھلے اڑایا لیکن وہ سب کچھ خاموشی سے سہارا دے اور کرتا بھی کیا۔ رشید کی طرح کھلتے کھتا گیا تھا۔ رشید نے انور کو کی باز چھوڑ دیا کہ وہ اسے سیاہ بکراج کا راز بتا دے مگر کام نہ رہا۔

اس میں اس شام انور کمر میسر کی کوشی کے پائیں باغ میں جیسا کمر میسر کا انتظار کر رہا تھا۔ اپنا لالہ کافی کارڈ اندر بھجوا کر وہ لان پر بیٹھ گیا تھا۔ نوکر نے آکر اس سے اٹھ کر چلے گئے۔

”میں یہیں کھلے میں بیٹھنا پسند کروں گا۔“ انور نے کہا اور لان تخت پر بیٹھ جا کر بیٹھ گیا۔ نوکر چلا گیا اور تموڑی دیر بعد کمر میسر پورے کھانے دیا۔ وہ آہستہ آہستہ لان کی طرف آ رہا تھا۔ چہرے سے مسکراہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ انور کو دیکھ کر اس نے کھانے پر ایک مضمحل سی مسکراہٹ کھینچ لی۔

جب کمر میسر انور میں اپنے راز کے کھانے کی گرفتاری پر آپ کو مبارکباد دے رہا تھا۔ اس نے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”آپ کو مبارکباد دے رہا تھا۔“

”شکریہ...“ انور سنجیدگی سے بولا۔ ”تو اس پر دھنیا کرنا چاہتے تھے۔“

میں اس نے چند لوگوں کو دعوت دی اس میں آپ اور آپ کی صاحبزادی بھی تھیں۔ کھانے کے بعد اس نے پتروں کی نمائش کی سیاہ بکھراج اس کے پاس دیکھ کر آپ کو بہت ناؤ آیا۔ والہی پر آپ نے گھوڑیا سے باز پرس کی۔ بہر حال آپ اسے دوبارہ واپس لینا چاہتے تھے اس لئے آپ نے پھر وجہ کمار کی خدمات حاصل کیں اور وہ اسے پروفیسر کے یہاں سے چلا لیا۔ دوسرے ہی دن صبح وہ پھر آپ کے پاس سے غائب ہو گیا۔ اس بار اسے آپ کی صاحبزادی نے اڑایا تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ دراصل آپ ہی کی ملکیت تھا۔ وہ اسے پروفیسر کے یہاں دیکھ ہی چکی تھی۔ اس لئے سمجھیں کہ شاید آپ اسے چلا لائے ہیں۔ لہذا انہوں نے اسے آپ سے چھپا کر واپس کرنے کی ٹھان لی اور اس سلسلے میں انہوں نے خاکسار کی خدمات حاصل کیں۔ میں نے جن حالات میں وہ پتھر اس کی جگہ پر پہنچایا وہ بہت ہی خطرناک تھے۔

”میں جانتا ہوں..... میں جانتا ہوں۔“ سر صفر بے مبری سے بولا۔

”اور میں تلخ پانچ ہزار روپے بطور حق الحقت طلب کر رہا ہوں اور ہاں شاید آپ یہ بھی سنا پسند کریں گے کہ پروفیسر کولس کے ہتھوڑے سے کس طرح قتل ہوا.....؟“ خیر سنئے..... آپ سمجھے تھے کہ شاید پروفیسر ہی نے اسے دوبارہ آپ کے پاس سے غائب کرا دیا۔ لہذا آپ پھر گھوڑیا کے پاس پہنچے اور اسے خوب کھری کھری سنائیں۔ اسی رات کو گھوڑیا نے سوچا کہ وہ کیوں نہ اس پتھر کو پروفیسر کے یہاں سے چرا کر اپنے ہاتھوں سے آپ کو واپس کر دے۔ وہ جانتی تھی کہ پروفیسر اسے تجوری میں رکھتا تھا۔ لہذا وہ کولس کا ہتھوڑا لے کر وہاں پہنچی۔ اسے یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ پروفیسر رات کو باہر ہی رہے گا۔ اس نے پروفیسر کی خواب گاہ کی کھڑکی کا شیشہ توڑا اور اندر داخل ہو گئی۔ لیکن وہ اچھی طرح سمجھ لیتی تھی کہ اسے مکان کے اندر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور وہ گھبراہٹ میں ہتھوڑا وہیں چھوڑ کر کھڑکی سے کود گئی۔ آنے والا پروفیسر کا قاتل تھا۔ اسے وہاں پہنچ کر یہ معلوم ہو گیا تھا کہ پروفیسر گھر پر موجود نہیں ہے اس لئے اس نے نہایت اطمینان سے اپنی کتھیں کا لہجہ استعمال کیا اور مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ موقع قیمت تھا اس لئے اس نے اترارنا سے کی تلاش شروع کر دی۔ لیکن اس کے کامیاب ہونے سے پہلے ہی پروفیسر آ گیا اور قاتل نے اسی ہتھوڑے سے اس پر حملہ کر دیا اور اسے ختم کرنے کے بعد بھاگ ہی رہا تھا کہ

وہ بے کلامی کی گویا اور پھر شاید اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے وہ بھی اس کے ہاتھ سے مارا گیا اور وہاں اس رات کو بھی آپ ہی نے وہ بے کلام کو وہاں بھیجا تھا کہ وہ اس پتھر کو دوبارہ چرا لائے۔ وہاں تو جناب جب میں وہاں پہنچا تو پروفیسر کی لاش سے مڈبیلز ہو گئی آپ خود سوچئے کہ وہ چیز کتنی خطرناک تھی اور پھر جبکہ پروفیسر تار جام ہی سے اسپیئر آف کو فون کر چکا تھا کہ اس کے مکان کی حفاظت کی جائے۔ اگر میں ذرا سا بھی چوک جاتا تو وہاں پکڑا گیا تھا۔“

انور خاموش ہو گیا۔

”میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ ان معلومات کو اپنے ہی تک محدود رکھئے گا۔“ سر صفیر نے کہا۔ ”راہد نے مجھے پہلے ہی اس کے حلق بتا دیا تھا اور میں بہت پریشان تھا۔“

سر صفیر نے چپک پر دھنکا کر دیئے۔

”شکریہ۔“ انور نے چپک بک تہہ کر کے جیب میں رکھے ہوئے کہا۔ ”مطمئن رہئے میں بلیک میل نہیں ہوں۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔ آداب عرض۔۔۔۔۔“

چپاک سے کل کردہ موٹر سائیکل کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ راہد نے اس کا راستہ روک لیا۔

”تو تم نے سب کچھ بتا دیا۔“ وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

”جنتا تم نے بتایا تھا اس سے آگے نہیں بڑھا۔“

”یعنی ک۔۔۔۔۔“

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ میں نے ان سے یہ نہیں بتایا کہ تم نے وہ رات نکالا مگر میں سیکرٹری کے ساتھ ہر کی تھی۔“

”شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔“

”ٹاٹا۔۔۔۔۔“ انور نے ہاتھ ہلایا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی۔

ختم شد